باب ۲

تفہیم زوال

﴿اَللّٰـهُمَّ أرِنِي الأشْيَاءَ كَمَا هِيَ﴾

قوموں کے عروج وزوال میں کلمہ یعنی نظریے کو کلیدی اہمیت حاصل ہے۔ امت مامور سے امت معزول تک پہنچنے میں بنی اسرائیل پر کیا گزری، وہ کن آلام ومصائب کا شکار ہوئے اور کس طرح دنیا کی منتخب ترین امت پر ذلت کا عذاب مسلط کر دیا گیا، اس کی بڑی دردناک تفصیل قرآن مجید کی ابتدائی سورتوں میں بیان کی گئی ہے۔ تاریخ انتہائی اعلیٰ اور مرتفع سطح پر اپنی تمام تر ابعاد کے ساتھ یہود ونصاریٰ کے حوالے سے ہم پر منکشف کر دی گئی ہے تاکہ ہم جو آخری امت مامور ہیں اپنے تاریخی سفر میں اس سے عبرت اور بصیرت حاصل کر سکیں۔ قرآن میں امم سابقہ اور بالخصوص اہل یہود کا تذکرہ جس تفصیل سے آیا ہے اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ان کی حیثیت سابقہ امت مامور کی ہے۔ ثانیاً بنی اسرائیل کو تمام عالم پر برگزیدگی اور بزرگی کا شرف حاصل رہا ہے۔ لیکن اس مقام مخصوص کو اور اپنے رب کی بے پایاں نعمتوں کی ناقدری کے نتیجے میں ان کی گرفت جس طرح سختی سے کی گئی ہے اس میں یہ سبق پوشیدہ ہے کہ محبوب ترین لوگ بھی اپنے اعمال کی وجہ سے مغضوب ترین لوگوں میں شامل ہوسکتے ہیں کہ خدا کے یہاں برگزیدگی کا پیمانہ عمل ہے، نسلی رشتے اور تفاخر نہیں۔ حضرت ابراہیمؑ نے جب اپنے رب کے حضور اپنی ذرّیت کا سوال رکھا تو وہاں بھی یہ بات صاف کر دی گئی کہ شرف وکرم صرف ان کے لئے مخصوص رہے گا جو راہ حق پر گامزن رہیں، نافرمان لوگ، خواہ ان کا تعلق ذرّیت ابراہیمی سے کیوں نہ ہو، اللہ تعالیٰ ان سے اپنی برأت کا اظہار کرتا ہے۔ بنی اسرائیل کے زوال وانحطاط کی داستان میں امت مسلمہ کے لئے اپنی تصویر کا دیکھ لینا اور اپنے موجودہ زوال کے اسباب تلاش کرنا کچھ زیادہ مشکل نہیں ہے۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے

کہ ہم قرآن کو کتابِ تاریخ و آثار کے بجائے کتابِ بصیرت وہدایت کی حیثیت سے رجوع کریں۔ اوران واقعات کا موراں سمجھنے کے لئے اپنے دل و دماغ کھلے رکھیں۔

ہمیں یہ حقیقت تسلیم کرلینی چاہئے کہ بنی اسرائیل کی طرح امت مسلمہ بھی سیادت کے منصب سے مدت ہوئی محروم کی جا چکی ہے۔ دنیا میں سیاہ وسفید کے فیصلے آج جو اقوام کر رہی ہیں، وہ یقیناً ہم نہیں ہیں۔ ہمارے یہاں زوال آہستہ آہستہ دبے پاؤں آیا ہے۔ چونکہ ہم عروج وزوال کو فتح وشکست کی سیاسی تاریخ سے ناپنے کے عادی ہوگئے ہیں اس لئے سقوط بغداد سے پہلے ہم زوال کا احساس بھی نہیں کر پائے۔ پھر سقوط بغداد کے بعد عالم اسلام میں جو نئے تہذیبی مراکز قائم ہوئے، اور عسکری فتوحات کا سلسلہ جس طرح جاری رہا، اس نے بھی ہمیں اس نظری التباس سے دو چار رکھا کہ ہم اب بھی امت مامور کے منصب پر فائز ہیں اور یہ کہ دنیا کا مستقبل ہم سے ہی وابستہ ہے حالانکہ شرع محمدی کی تصویر جس طرح رفتہ رفتہ بدل کر دین ملوکیت کی ہوگئی تھی اور جس طرح مشائخیت اور ملوکیت نے مسلم معاشرے پر اپنی گرفت سخت کرلی تھی ان حالات میں یہ صاف نظر آتا تھا کہ ایک نئی یہودیت دین محمدی میں اپنا مقام بنا چکی ہے۔کلمہ یعنی وحی ربانی جس کی تجلیوں سے معاشرہ منور ہوتا اور افراد کے قلب ونظر میں جھٹکے لگتے اب اسے مشائخیت کے قیل وقال نے جامد مذہب اور مردہ رسوم کی شکل دے دی تھی۔ کہنے کو تو کتاب محفوظ تھی لیکن اس پر تاریخ وروایات اور انسانی تشریح وتعبیر کا پہرہ اتنا سخت تھا کہ عام انسان یہی سمجھنے میں عافیت محسوس کرتا تھا کہ وحی سے براہ راست اکتساب فیض کا کام اگلے کر چکے۔آسمان کے نیچے اب کوئی ایسا مسئلہ نہ رہا جس پر غور وفکر کرنا باقی رہ گیا ہو، یہ سمجھ لیا گیا کہ اولاً وحی ربانی سے براہ راست اکتساب کی ضرورت نہیں اور اگر اس کتاب تلاوت سے کسی کو طلب ہدایت مقصود ہی ہو تو اس کے لئے لازم ہے کہ وہ متقدمین کی آنکھ سے اس کتاب کا مطالعہ کرے اور ان کے دماغ سے سوچے۔سلف کے فہم سے ذرہ برابر بھی انحراف گمرہی پر محمول کیا گیا۔ جوں جوں صدیاں گزرتی گئیں وحی کے گرد متقدمین کا حصار سخت ہوتا گیا۔علوم وفنون کے غیر ضروری مباحث اور فقہی موشگافیوں نے اس سرمایے میں اتنا اضافہ کردیا کہ عوام تو عوام خواص کے لئے اس حصار کا عبور کرنا ناممکن ہوگیا۔ وحی کے گرد انسانی تشریح وتعبیر کی مسلسل پڑنے والی گرد نے کلمہ کو اس کی potential تسخیری قوت کے باوجود عملی طور پر اسے معطل کئے رکھا۔

ایک حدیث میں امت مسلمہ کے سلسلے میں یہ پیش گوئی کی گئی ہے کہ اس کا ارتقاء بہت کچھ اہل یہود کی طرح ہوگا۔ دونوں میں اتنی مشابہت ہوگی جتنی ایک ہی شخص کی دو جوتیوں میں ہوتی ہے۔اس حدیث

کی سند سے قطع نظر اس بیان سے کم از کم اتنا تو سمجھ میں آتا ہے کہ جس عہد میں یہ حدیث سامنے آئی ہے اس عہد میں اہل فکر کو یہ احساس ہونے لگا تھا کہ بدقسمتی سے امت مسلمہ اہل یہود کے راستہ پر چل نکلی ہے۔ لیکن ہم جو روایتی تفسیروں میں مغضوب علیہم سے اہل یہود مراد لینے کے عادی ہیں۔ اس سادہ اصول کو نظر انداز کر گئے کہ اللہ کا غضب ہر اس امت کا مقدر ہے جس نے راہ راست کو ترک کر دیا ہو۔

ہمارے زوال کی وجہ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ قرآن مجید میں اہل یہود کے واقعہ عبرت کے باوجود ہم بدقسمتی سے اسی راستے پر چل نکلے ہیں۔ اور چونکہ اللہ کا قانون اٹل ہے ﴿ولن تجد لسنة الله تبديلا﴾ اس لئے ہم بھی اہل یہود کی طرح منصب سیادت سے معزول کر دیئے گئے ہیں۔ بس ہم میں اور اہل یہود میں فرق صرف اتنا ہے کہ ان کے یہاں وحی ربانی، انسانی تشریح وتعبیر اور فقہی تحلیل وتاویل میں اس طرح مسخ ہوگئی تھی کہ ایک کا دوسرے سے الگ کرنا مشکل تھا البتہ ہمارے یہاں وحی اپنی اصلی شکل میں اب بھی محفوظ ہے۔ انسانی تشریح وتاویل نے اس کے گرد جو حصار بنایا ہے اسے توڑنا گو کہ آسان نہیں البتہ خود اس کتاب محفوظ میں اس حصار کو توڑنے کا طریقہ موجود ہے۔ یہی وہ بنیادی فرق ہے جو امت مسلمہ کو معزولی کے باوجود حاملین وحی کی حیثیت سے برقرار رکھتا ہے۔ اور بلا شبہ یہ ایک ایسا اعزاز ہے جو اس وقت اس سرزمین پر کسی اور امت کو حاصل نہیں۔

بلاشبہ اہل یہود کی تاریخ میں ہمارے لئے بہت کچھ ہے۔ بسا اوقات ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہم اہل یہود کے تذکرے میں اپنے زوال کی داستان پڑھ رہے ہوں۔ اور ایسا فطری بھی ہے۔ البتہ حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ دونوں کے یہاں فکری انحراف کا سفر تقریباً ایک ہی خطوط پر ہوتا ہے۔ کلمہ کے گرد انسانی قیل وقال کا حصار جس طرح اہل یہود نے کیا بدقسمتی سے اسی عمل میں مسلمان بھی مبتلا ہوگئے۔ اس کی ایک وجہ شاید یہ بھی ہو کہ ابتدائے اسلام سے ہی یہودی علماء اسلام قبول کرتے رہے ہیں۔ ان کے قبول اسلام کے محرکات خواہ کچھ بھی ہوں اس بات سے صرف نظر نہیں کیا جاسکتا کہ آنے والا اپنا تہذیبی ورثہ بھی ساتھ لاتا ہے۔ بالخصوص ایک ایسے مذہب میں جو یہودی اور عیسائی روایات کی تکمیل کے طور پر اپنے آپ کو پیش کرتا ہو۔ ان میں یہودی اور عیسائی مآخذ سے استفادے کا رجحان عین فطری ہے۔ اس لئے اسلامی نظریے کی تحلیل میں اہل کتاب کے علوم اور سابقہ ماخذ سے اکتساب فیض کو یکسر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

اسلامی نظریے پر یہودی اثرات تین سطحوں پر مرتب ہو رہے تھے۔ اولاً یہودی علماء کی ایک قسم تو ان صادقین پر مشتمل تھی جس کی نمائندگی عبداللہ بن سلام جیسے برگزیدہ صحابی کرتے تھے۔ اور جس کا اظہار

ام المؤمنین حضرت صفیہؓ کی ان شہادات سے ہوتا تھا جو ایک یہودی عالم کی بیٹی کی حیثیت سے نئے دین کے بارے میں پیش کر رہی تھیں۔ اس قبیل کے علماء کا وظیفہ یکسر مثبت تھا کہ وہ سابقہ صحف سماوی کی روشنی میں نئی رسالت کی تصدیق کر رہے تھے۔ یہودی علماء کی ایک دوسری نسل ان لوگوں پر مشتمل تھی جن کے نمائندہ ناموں میں کعب بن احبار (متوفی ۶۵۲) اور وہب بن منبّہ (متوفی ۷۲۸) جیسے لوگوں کے نام آتے ہے۔ اسلام تو یہ بھی لے آئے تھے اور مسلم معاشرے میں ان کی خدمات بھی مستحکم تھیں لیکن نئی وحی کو سمجھنے میں ان کی سابقہ معلومات برابر مداخلت کرتی رہتی تھیں۔ کعب بن احبار ایک یمنی یہودی تھے جو حضرت عمرؓ کے عہد میں داخل اسلام ہوئے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ بیت المقدس کے سفر میں آپ نے حضرت عمرؓ کی رہنمائی بھی کی تھی۔ ان کی اس مسلمہ حیثیت کے باوجود فکر اسلامی کی تشریح وتعبیر کے سلسلے میں ان کی مساعی غیر متنازعہ نہیں تھیں۔ خود عہد صحابہ میں یہودی مآخذات کی روشنی میں اسلامی نظریے کی تفہیم کے سلسلے میں آپ کی فہم پر انگلی اٹھ چکی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ ابو ذرؓ نے بعض معاملات میں کعب کی تنبیہ کے لئے کوڑے بھی لگوائے۔ لیکن مسلم تاریخ اور حدیث کی کتابوں میں کعب ایک معتبر راوی کی حیثیت سے معروف رہے ہیں۔ اسی طرح وھب بن منبہ جن سے حدیث کا ایک قدیم ترین مسودہ منسوب ہے، بھی ایک نومسلم یمنی یہودی تھے۔ اپنے عہد میں وہ یہودی اور عیسائی مآخذ پر سندِ فضیلت کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان سے کتاب الاسرائیلیات بھی منسوب ہے جسے اہل کتاب سے متعلق علوم پر ایک مستند تصنیف قرار دیا جاتا ہے۔ اس کتاب اور اس کے مصنف کا اسرائیلیات کے عام کرنے اور اسے اسلام کی تفہیم میں معاون لٹریچر کی حیثیت سے منوانے میں کلیدی رول رہا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ انہیں بھی یمن کے گورنر کے حکم پر کوڑے لگوائے گئے تھے۔ یہودی علماء کی تیسری نسل ان لوگوں پر مشتمل تھی جنھوں نے اس لئے اسلام قبول کرلیا تھا کہ اس کے بغیر حکومت کے اعلی عہدوں تک پہنچنا ممکن نہ تھا۔ عہد عباسی میں جب غیر عربوں کے لئے اہم عہدوں کا حصول ممکن ہوگیا تھا۔ یہودی علماء اور دانشوروں میں بہت سے لوگ ایسے بھی تھے جو نئے مذہب میں داخلے کے بعد سماجی اور سیاسی طور پر مراعات کے حصول میں کچھ حرج نہ سمجھتے تھے۔ یہودی علمی اور معاشی طور پر اس لائق تھے کہ وہ سیاسی تبدیلیوں سے فائدہ اٹھاسکیں۔ اس قبیل کے لوگوں میں سب سے اہم نام یعقوب بن کلیث البغدادی (۹۹۱-۹۳۰) کا ہے جس نے فاطمیین کے مصر میں پالیسی ساز عہدہ حاصل کیا۔ کہا جاتا ہے کہ اسماعیلی مذہب کے خدوخال طے کرنے میں اس کا کلیدی رول ہے۔ اسے اپنے عہد میں اسماعیلی فقہ پر سند کی حیثیت حاصل تھی۔

یہ بات بھی محل نظر رہے کہ ابتدائی عہد میں اسرائیلیات کے سلسلے میں مسلم علماء کا رویہ کسی قدر

اثبات لئے ہوئے تھا۔ انبیاء کے قصے، کائنات کی تاریخ، تخلیق آدم کا واقعہ، فرشتوں کے بیان، اور اس قسم کے دوسرے موضوعات پر جو تفصیلات قرآن میں نہیں ملتی تھیں وہ بآسانی سابقہ کتب سماوی اور ان کی تشریحات میں مہیّا تھیں۔ ابتداء میں ان مآخذ کے سلسلے میں مسلمان علماء نے قدرے مثبت انداز اختیار کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہودی اور عیسائی مآخذ سے بہت سی تفصیلات ہماری تشریح وتعبیر کی کتابوں میں در آئیں۔ اس طریقے نے خاص طور پر قرآن مجید کی تشریح وتعبیر کو متاثر کیا۔ آگے چل کر ان علوم کے سلسلے میں ایک تنقیدی رویہ پیدا ہوا لیکن ابتدائی چند صدیوں میں معلومات اور تفسیر قرآنی کا جو انداز اور اس سے احکام برآمد کرنے کا جو طریقہ رائج ہو گیا تھا اس کی تلافی ممکن نہ ہو سکی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وحی کے گرد جس طرح اہل یہود نے تلمود کا حصار کھینچا تھا تقریباً اسی طرح ہم مسلمانوں نے بھی اسے تاریخ اور فقہ کا قیدی بنا دیا۔

تورات جو اہل یہود کی بنیادی کتاب ہے اور جس کے منزّل من اللہ ہونے پر خود قرآن گواہ ہے اگر اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ محفوظ ہوتا تو اہل یہود کا منصب سیادت بھی محفوظ رہتا لیکن خدا کا یہ میثاق اہل یہود پر اتنا گراں گزرا کہ وہ اسے کتاب ہدایت تو کیا بناتے خود اس کے قابل عمل ہونے کے سلسلے میں شبہات کا شکار ہو گئے۔ خمسہ موسوی (Torah Shebikhtab) میں خدائی احکام یہود کو اتنے سخت اور منجمد معلوم ہوئے کہ انہوں نے اس میں لچک پیدا کرنے کے لئے زبانی توراۃ (Torah Shebalpeh) کا عقیدہ گڑھ لیا۔ ایک تورات سے دو تورات بنا دی گئی۔ ایک تو کتاب ہدایت تھی جسے اللہ نے نازل کیا تھا اور دوسری کتاب الامانی جو اہل یہود کی خواہشات کی پیداوار تھی۔ کہا یہ گیا کہ موسیٰ کو تورات کی شکل میں تحریری حکم نامے تو ملے ہی تھے اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے چالیس دنوں تک زبانی بھی کچھ احکام دیئے تھے جو بعد کے نبیوں اور علماء ومشائخ کی زبانی ہم تک پہنچے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔ اس لئے تحریری تورات کو زبانی تورات کے بغیر نہیں سمجھا جا سکتا۔ بعض اوقات زبانی تورات کو اللہ کی خاص نعمت بتا دیا گیا جس کی روشنی میں تحریری تورات کے سخت گیر اصولوں میں لچک پیدا کرنا ممکن ہو سکا۔ حالانکہ تورات جو الواح کی شکل میں تحریری طور پر موسیٰ کو عطا کی گئی تھی اور انہدام معبد کے بعد خمسہ موسوی کے مصنفوں نے اسے محفوظ کرنے کی کوشش کی تھی، ایک تاریخی دستاویزی حقیقت تھی جبکہ زبانی تورات صدیوں کے زبانی اقوال، بزرگوں اور مشائخ سے سنی سنائی باتوں پر مشتمل تھے۔ اور جس میں عام رہائیوں اور بزرگوں کے اقوال وافکار بھی شامل ہو گئے تھے۔ لیکن اس تاریخی حقیقت کے باوجود تحریری اور زبانی تورات کو وحی کے دو ماخذ کی حیثیت سے قبول کر لیا گیا۔ تورات خصوصیت کے ساتھ خمسہ موسوی کو قرار دیا گیا اور مشناۃ اور گمارا کو

زبانی تورات کی دستاویزی حیثیت دے دی گئی[1]۔اس طریقۂ کار کا نتیجہ یہ ہوا کہ خمسہ موسوی انسانی فہم اورتاریخی بیان کے تابع ہوکر رہ گئی۔طُور پر موسیٰ کو جو اَلواح عطا کی گئی تھیں ان کی تعداد محدود تھی لیکن اس کی تفہیم کے لئے زبانی تورات کا جوعقیدہ قبول کرلیا گیا وہ صدیوں کے انسانی ورثہ علم پر محیط ہوگیا۔آج یہودی فکر میں تلمود کے بغیر خمسہ موسوی کی تفہیم کا کوئی تصور نہیں پایا جاتا۔خمسہ موسوی کے گرد تلمود کا یہ حصار اتنا سخت ہے کہ تحریری تورات زبانی تورات کے تابع ہوگئی ہے۔

اب ذرا امت مسلمہ کی خبر لیجئے جس کے یہاں آج بھی آخری وحی پوری آب وتاب کے ساتھ محفوظ ہے۔لیکن یہاں بھی وحی کے گرد مشناتی ادب کا وہی حصار ہے۔صدیوں میں اسلامی فکر نے جوشکل اختیار کی اسے اسلاف کے مستند طریقۂ فہم سے تعبیر کیا جاتا ہے جس سے الگ کسی فہم کو اعتبار نہیں[2]، ہمارے یہاں بھی وحی کی دوقسموں کا عقیدہ در آیا ہے۔ایک کو وحی متلو اور دوسرے کو وحی غیر متلو قرار دیا گیا۔کہا گیا کہ وحی متلو قرآن کی شکل میں محفوظ ہے اور وحی غیر متلو وہ احکام وفرامین ہیں جو اللہ تعالیٰ نے قرآن کے علاوہ بھی محمد رسول اللہ کو بتائے تھے اور جس کے مستند مجموعے تیسری صدی ہجری میں محدثین کے ہاتھوں مرتب ہوئے اور جنہیں عرف عام میں صحاح ستہ یا کتب تسعہ کے نام سے جانا جاتا ہے۔جمہور مسلمانوں میں اس عقیدے نے اپنی جگہ بنالی کہ وحی کا مکمل بیان صرف قرآن مجید میں نہیں ہے بلکہ اس سے باہر بھی بہت کچھ موجود ہے۔صوفیاء نے اس سلسلے کو مزید طول دیتے ہوئے براہ راست رسول اللہ سے احادیث روایت کرنی شروع کردی[3]گو کہ صوفی احادیث کو امت میں سند کی حیثیت حاصل نہیں ہوسکی۔البتہ احادیث کے انسانی مجموعے کے سلسلے میں یہ عقیدہ پختہ ہوتا گیا کہ ان میں بعض کتابیں اصح الکتاب بعد کتاب اللہ کی حیثیت رکھتی ہیں اور ان میں وحی غیر متلو کو محفوظ کرلیا گیا ہے، جس کے بغیر قرآن کی تفہیم ممکن نہیں۔گویا یہاں بھی زبانی اور تحریری تورات کے تصورات نے اپنی جگہ بنالی اور عملی طور پر ہوا یہی کہ تحریری وحی زبانی وحی کے تابع ہوکر رہ گئی، اس بارے میں مزید تفصیلات حدیث کے باب میں آئیں گی۔

علمائے یہود نے وحی کے گرد باطنیت کے نام سے ایک اور حصار بنا ڈالا۔تصوف کے زیر اثر وحی الٰہی کے باطنی اور حقیقی معنی کی بحث چھڑ گئی یہودی صوفیاء اس نتیجے پر پہنچے کہ ''تورات کی روح دراصل اس کے باطنی معنوں میں پوشیدہ ہے۔انسان ہر مقام پر خدا کا جلوہ دیکھ سکتا ہے، شرط یہ ہے کہ وہ تورات کے ان باطنی معانی کا راز پاجائے اور اس کے مطابق زندگی بسر کرے۔'' تورات جو بنی اسرائیل کے لئے کتابِ ہدایت تھی اپنے باطنی معنی کی وجہ سے صرف خواص کے لئے مخصوص ہوگئی۔''مشناۃ'' میں باضابطہ اس بات کی

صراحت کردی گئی کہ کتاب پیدائش کے باطنی معنی کی تعلیم ایک وقت میں ایک سے زیادہ آدمیوں کو نہ دی جائے، اس کی سخت ممانعت ہے یہ بھی کہا گیا کہ کتاب ''حزقیل'' کے پہلے باب کی تعلیم تو ایک آدمی کو بھی نہیں دینی چاہئے الّا یہ کہ اس نے مقام ولایت حاصل کرلیا ہو[۴] ''زہار'' جسے یہودی تصوف کی معتبر ترین کتاب سمجھا جاتا ہے، ذاتی مکاشفات کے سہارے تورات کی تشریح وتعبیر کے لئے معروف ہے۔

ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ مسلمانوں میں بھی قرآن کے باطنی معانی کا تصور اتنا ہی مقبول خیال ہے جتنا کہ یہودیت میں۔ البتہ یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ قرآن کے باطنی معانی کا تصور ہمارے علمی ورثے میں بالکل اجنبی خیال نہیں ہے کہ تصوف کے شیخ الشیوخ علامہ ابن عربی اپنے تمام تر انحراف اور گمرہی کے باوجود ہمارے تہذیبی اور علمی ورثے میں آج بھی سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں ''فصوص الحکم'' اور ''فتوحات مکّیہ'' سلوک واحسان کی بنیادی کتابیں سمجھی جاتی ہیں انہی ابن عربی کا کہنا ہے کہ قرآن میں حروف واعداد کے اندر پراسرار معانی پوشیدہ ہیں، جن تک رسائی صرف اہل باطن کو ہوسکتی ہے۔ ان کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ اہل باطن دین کے علم کو خدا اور رسولؐ سے براہ راست لیتے ہیں۔ بقول ان کے ''جس مقام سے نبی لیتے تھے اسی مقام سے انسان کامل، صاحب الزماں، غوث اور قطب لیتے ہیں''[۵] چونکہ مسلمانوں نے اصولی طور پر یہ عقیدہ تسلیم کرلیا ہے کہ رسولؐ اللہ کو وحی کے علاوہ وحی خفی یا الہام بھی ہوتا تھا اور چونکہ الہام ایک ایسی کیفیت ہے جس کے دعویدار صوفیاء بھی ہیں اس لئے قرآن مجید میں باطنی مفہوم متعین کرنے کے لئے الہام کی یہ سند کارگر ثابت ہوئی۔ اسی نظریے نے شریعت اور طریقت کے تصورات کو جنم دیا۔ اس قسم کی حدیثیں سامنے لائی گئیں کہ بقول ابو ہریرہؓ ''رسول ﷺ نے مجھے دو برتن عطا فرمائے، ایک کو میں نے کھول کر عام کردیا ہے اگر دوسری کو بھی کھول دوں تو ڈر ہے کہ میری شہ رگ نہ کاٹ دی جائے۔''[۶] یہ علم جسے ابو ہریرہؓ نے عام لوگوں پر منکشف نہیں کیا وہی طریقت اور باطنی علم ہے۔ جس تک رسائی ہر خاص وعام کے لئے ممکن نہیں۔

قرآن ہو یا تورات باطنی معانی کی تلاش کا کام دراصل اس کی تنسیخ وتحریف کا عمل ہے ۔ یہ دراصل اپنی خواہشات کو آیات الٰہی پر مسلط کردینے کے مترادف ہے۔ ہمارے خیال میں قرآن کی اس طرز کی صوفی تعبیریں بڑی حد تک یہودی تصوف کی دین ہیں۔ اور اس طرز تعبیر پر ''زہاری تصوف'' کی چھاپ نمایاں ہے۔ انہی پوشیدہ معانی کی تلاش میں اہل یہود کی طرح ہمارے علماء بھی حروف اور اعداد کے علوم کی طرف متوجہ ہوئے۔ اور اہل یہود کی طرح ہی ہمارے یہاں بھی یہ خیال پیدا ہوا کہ وحی کے اصل معانی یا اس کی سریت الفاظ کو ایک خاص طریقے سے ترتیب دینے اور اس کے اعداد متعین کرنے میں ہے۔ قرآنی

نقوش میں علم اعداد کی سریت بڑی حد تک یہودی ماخذ سے مستعار ہے۔ مسلمانوں میں باطنی علوم کے علمبرداروں کو خواہ کتنی ہی محدود کامیابی کیوں نہ ملی ہو، واقعہ یہ ہے کہ اصحاب کشف اور اہل سلوک کو مروّجہ مسلم فکر سے یکسر الگ نہیں کیا جا سکتا۔

وحی کی تفہیم میں یہودی مآخذ سے استفادہ اور یہودی طریقۂ تفہیم کی مداخلت نے مزید پیچیدگیوں کو جنم دیا۔ مسلمانوں کا رویہ بھی کتاب الٰہی کی طرف کچھ اسی انداز کا ہو گیا جس کی روایت اہل یہود کے یہاں موجود تھی۔ مثال کے طور پر یہودیوں کی طرح ہمارے یہاں بھی یہ عقیدہ در آیا کہ تورات کی طرح قرآن مجید کا اصل نسخہ آسمانوں میں محفوظ ہے۔ سورہ بروج میں قرآن مجید کا لوح محفوظ میں ہونے کا جو تذکرہ آیا ہے اس سے یہ سمجھ لیا گیا کہ یہ لوح محفوظ آسمانوں میں کہیں واقع ہے۔ حالانکہ کسی ایسی تاویل کی نہ تو اس آیت میں گنجائش تھی اور نہ ہی رسول اللہ ﷺ نے اس طرح کی کوئی بات ارشاد فرمائی تھی۔ لوحِ محفوظ کا مطلب اس کے علاوہ اور کچھ نہ تھا کہ یہ کتاب ایک ایسے عہد میں نازل ہو رہی تھی جب تحریر نویسی ایک معروف فن کی حیثیت سے جانی جاتی تھی اور وقت کا رسولؐ اسے خود تحریری شکل میں مرتب کر رہا تھا۔ صحابہ کرامؓ کو یہ بات بتائی جا رہی تھی کہ قرآنِ مجید کو دیکھ کر پڑھنا اور تحریری دستاویز سے اس کی تعلیم و تعلّم کا کام زبانی کے مقابلے میں زیادہ مناسب ہے۔ وحی کے نسخے تحریری شکلوں میں لوگوں کے درمیان گردش میں تھے۔ اس کے علاوہ آپؐ کا اس بارے میں احتیاط کا یہ عالم تھا کہ اسے خود یاد کرنے اور صحابہ کرام کو یاد کرانے کے باوجود اس کے تحریری حفظ اور املاء کا خاص اہتمام فرما رہے تھے۔ یہ بات تاریخی طور پر ثابت ہے کہ آپؐ کے وصال سے پہلے قرآن مجید دفتین میں مرتب ہو چکا تھا۔ وحی کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا جب اس کے تعلیم و تعلّم، حفظ و قرأت اور تحریر و املاء کے ذریعے اس کی حفاظت کا انسانی سطح پر اتنا منظّم اور محتاط انتظام کر دیا گیا ہو۔ یہی وہ لوح محفوظ تھا جس کو مداخلت شیطانی اور ترمیم و تنسیخ کے عمل سے محفوظ کر دینے کا خود اللہ تعالیٰ کا وعدہ تھا اور جس کی تصدیق پر آج بھی چودہ صدیوں کی انسانی تاریخ گواہ ہے۔ اس سیدھی سادی بات اور امر واقعہ کو یہودی معلومات کی مداخلت نے ایک معمہ بنا ڈالا۔ کسی نے کہا لوحِ محفوظ آسمانوں میں ہے جہاں تک شیطان کی رسائی نہیں۔ تو کسی نے اسے اسرافیل کی پیشانی پر ثبت بتایا۔ کسی نے کہا کہ اس سے مراد اُمّ الکتاب ہے جس میں قرآن اور تمام کتب سماوی محفوظ ہیں۔ بعض کمزور روایتوں کو احادیث کا درجہ دے کر یہ باور کرانے کی کوشش کی گئی کہ لوحِ محفوظ دراصل ایک ایسا خزینۂ علم ہے جس میں مستقبل کا سارا علم بند ہے، خود اللہ سبحانہ تعالیٰ اس میں ہر دن ۳۶۰ مرتبہ دیکھتا ہے۔ اسی میں لکھا

ہے کہ آج کون گرا ہوا اٹھے گا اور کون اٹھا ہوا گرے گا، کون فقیر امیر ہو جائے گا اور کون امیر فقیر، کسے مرنا ہے اور کسے جینا ہے۔ کسی نے کہا کہ لوحِ محفوظ میں سب سے پہلی چیز جو اللہ تعالیٰ نے لکھی وہ یہ بات تھی کہ میں اللہ ہوں میرے علاوہ کوئی اللہ نہیں۔ محمدؐ میرے رسول ہیں، جس نے ہماری قضا کے آگے سر جھکا دیا اور میری طرف سے بھیجی گئی بلاؤں پر صبر کیا، میری نعمت کا شکر گزار ہوا تو اسے ہم نے صدیقین میں لکھ لیا اور جس نے ایسا نہ کیا تو وہ ایسا ہی ہے جیسے اس نے میرے علاوہ کسی اور کو الٰہ بنا لیا۔ کسی نے کہا کہ اس لوح کی لمبائی آسمان و زمین کی مسافت کے برابر ہے اور اس کی چوڑائی مشرق و مغرب پر محیط ہے۔ کسی نے یہ روایت کی کہ لوحِ محفوظ درّہ بیضاء سے بنایا گیا ہے اور اس کے صفحات لال یاقوت سے بنائے گئے ہیں اور اس کی کتابت و طباعت میں نور ہی نور استعمال ہوا ہے۔ گویا جتنے منہ اتنی باتیں۔ یہ تمام روایتیں ضعیف الاصل اور انسانی ذہن کی اختراع ہیں۔ صاحب جلالین کا خیال ہے کہ ان تمام مباحث کی کوئی سند نہیں لیکن یہ بھی امر واقعہ ہے کہ طبری، قرطبی اور ابن کثیر جیسی معتبر اور ثقہ تفسیروں میں اس قسم کی تشریحات کی بھرمار ہے۔ دفتین والی کتاب کے تذکرے کو جسے دراصل امت مسلمہ کے Mission Statement کی حیثیت حاصل ہے، آپ نے دیکھا کس طرح زمین سے اٹھا کر آسمانوں میں محفوظ کر دیا گیا اور امت مسلمہ بھی اہل یہود کی طرح اپنے صحیفہ کے سلسلے میں ان ہی اوہام کا شکار ہوگئی کہ ہمارے پاس جو کچھ ہے وہ تو بس ایک پرتو ہے، اس قرآن مجید کا جس کا اصل عرش کے دائیں طرف لوحِ محفوظ میں ہے۔[۸]

لوحِ محفوظ کی یہ تشریح تو ہم نے محض از راہ مثال پیش کی۔ دراصل ہم جو بات بتانا چاہ رہے ہیں وہ یہ ہے کہ اہل یہود کے علمی ماخذ کے زیر اثر ہمارے یہاں یہ رویہ پیدا ہوا ہے کہ وہ تمام کام جو امت مامور کی حیثیت سے ہمیں بہ نفس نفیس اسی دنیا میں انجام دینا ہے اور جس کے لئے ہم مذہبی طور پر سزاوار ہیں۔ ان تمام کاموں کو بھی ہم نے دوسری دنیا کے لئے مؤخر کر دیا ہے یا کم از کم یہ آس لگائے بیٹھے ہیں کہ کسی مردِ غیب کے ظہور سے خود ہی تمام مسائل حل ہو جائیں گے۔ مسیحا کی آمد کے سلسلے میں ہم پہلے باب میں یہ بتا چکے ہیں کہ کس طرح یہودی اور عیسائی خیالات کے زیر اثر مسلمانوں میں مہدیٔ آخر الزماں، مسیح موعود یا مجدد کا عقیدہ در آیا ہے۔ ایک ایسی امت کے لئے جو ختم نبوت پر یقین رکھتی ہو، یہ عقائد سم قاتل ہیں۔ لیکن ہم جو بے عملی کے شکار اچھے وقتوں کے انتظار میں مردِ از غیب کی راہ تک رہے ہیں صرف خواہشات اور وظائف کے زور سے نبی آخر کو مقامِ محمود پر فائز دیکھنا چاہتے ہیں۔ اپنی سہولت کے لئے ہم نے مقامِ محمود کو بھی آخرت میں منتقل کر دیا ہے، جہاں اس منصب مخصوص سے عقیدہ شفاعت وابستہ ہے، حالانکہ

مقامِ محمود کے لئے کی جانے والی دعا کا اس کے علاوہ اور کچھ مقصود نہیں کہ محمدؐ کا مشن پورا ہو، دین غالب ہو اور پوری دنیا پر محمدی نظام عدل کا پرچم لہرانے لگے۔ اس کے برعکس یہ سمجھنا کہ یہ کوئی منصب مخصوص ہے جس پر آخرت میں رسولؐ کو فائز کیا جانا ہے اور جس کے لئے اللہ کا وعدہ بھی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے اس وعدے کو پورا نہ کرے۔ پھر اس بارے میں کسی تشویش میں مبتلا ہونے کی ضرورت ہی نہیں۔ اس دعا میں ہمارا کوئی رول تو اسی وقت ہوسکتا ہے جب اسے ہماری کوششوں سے اس سرزمین پر انجام پانا ہو۔

آخری امت کی حیثیت سے قرآنی وحی ہمارے لئے قیمتی سرمائے کی حیثیت رکھتی ہے، لیکن افسوس کہ ہمارے غلو نے ہمارے اور وحی کے درمیان تقدس کا ایک ایسا حجاب حائل کردیا جس نے اس کتاب ہدایت کو کتاب امانی میں تبدیل کردیا۔ ایک بات تو یہ کہی گئی کہ قرآن کا ہر لفظ باعث برکت ہے، اس کا پڑھنا، سننا، دیکھنا خواہ اس کے معانی و مفاہیم سے واقفیت ہو یا نہ ہو اپنی جگہ باعث خیر و برکت ہے۔ بعض آیتوں اور سورتوں کے سلسلے میں مخصوص خاصیتیں بتائی گئیں اور ان کے بارہا پڑھے جانے کو بلاؤں سے نجات اور آخرت میں کامیابی کا ضامن قرار دیا گیا۔ یہ کم وبیش وہی عمل تھا جو اہل یہود اپنی مقدس کتاب کے سلسلے میں انجام دے چکے تھے۔ ان کے ربائیوں نے یہ کہہ رکھا تھا کہ جس شخص کے کان میں تورات کے الفاظ ایک بار بھی پڑ گئے ہوں اس پر دوزخ کی آگ حرام ہے، حتیٰ کہ کسی یہودی نے اگر یہودی ربائیوں اور بزرگوں کا نام بھی احترام ومحبت سے لیا ہو تو یہ بات خود جنتی ہونے کے لئے کافی ہے۔ پھر یہ عقیدہ بھی وضع کیا گیا کہ قیامت کے دن حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شفاعت کسی مختون اسرائیلی کو جہنم میں جانے نہ دے گی[9]۔ اس طرح کی باتوں سے وحی سے اکتساب فیض کا عمل برکتوں کے حصول تک محدود ہوگیا۔ ساری توجہ متن کی ظاہری شکل وصورت، اس کی قرأت وکتابت پر مرکوز رہی۔ یہودیوں کی طرح مسلمانوں میں بھی وحی کی آیات کو خوبصورت طغرے اور مرصع کتابت میں لکھنے کا رواج پیدا ہوا۔ ایک طرف تو وحی کو حصول برکت کا ذریعہ بنا کر اس کے اصل مطالب سے دوری اختیار کی گئی اور دوسری طرف یہ بتانے کی کوشش کی گئی کہ وحی سے اکتساب ہر خاص و عام کے بس کا کام نہیں۔ یہودیوں نے تورات کو تلمودی علوم کا تابع کر رکھا تھا، ان کے یہاں یہ بات مسلّم تھی کہ یہودی علماء ومفسرین سے الگ ہٹ کر نہ تو تورات کی کوئی تفہیم مستند ہوسکتی ہے اور نہ ہی یہ کسی شخص کے بس کی بات ہے کہ وہ براہ راست تلمودی سلسلۂ علم سے مستغنی ہوکر، تورات سے اکتساب کرسکے۔ کچھ اسی قسم کی صورت حال قرآنی وحی کے سلسلے میں مسلمانوں کے یہاں پیدا ہوگئی۔ ائمہ اربعہ کی تقلید کو عقیدے کا سا اعتبار حاصل ہوگیا۔ رہا قرآن سے براہِ راست اکتساب کا

معاملہ تو اس بارے میں ایک عمومی رویہ یہ پیدا ہوا کہ راست اکتساب کا کام صرف مجتہد ہی کرسکتا ہے اور مجتہد وہ ہے جو بقول علامہ بغوی ''پانچ قسم کے علوم کا جامع ہو: کتاب اللہ کا علم، سنت رسول کا علم، علمائے سلف کے اقوال، علم اللغۃ پر عبور اور قیاس کا علم۔ اس کے علاوہ اسے ناسخ ومنسوخ، مجمل ومفصل، خاص و عام، محکم ومتشابہ، کراہۃً اور تحریم، مستحب اور وجوب سے پوری واقفیت بھی ہو۔ فن حدیث میں ضعیف، مسند اور مرسل کے بارے میں باخبر ہو، قرآن و حدیث کے بظاہر اختلاف میں تطبیق کا فن جانتا ہو، احکام کے سلسلے میں صحابہ وتابعین کے اقوال اور جمہور فقہائے امت کے فتاوی سے آگاہ ہو۔ اگر کسی کے اندر کم ازکم اتنی خصوصیات جمع ہوجائیں جب ہی اسے اس بات کا حق حاصل ہے کہ وہ وحی سے راست اکتساب کے لئے رجوع کرے۔'' ظاہر ہے کہ اتنی بہت سی خصوصیات اور اتنے بہت سے علوم کا جامع ہونا ایسی شرط ہے جو عام پڑھے لکھے مسلمان کو کتاب ہدایت سے براہِ راست اکتساب کے لئے un-qualified قرار دیتی ہے[10] ایسے لوگوں کے لئے اس کے علاوہ اور کوئی راہ نہیں رہ جاتی کہ وہ کتاب ہدایت کو اپنے غور وفکر کا محور بنانے کے بجائے اسے کتاب فضائل یا کتاب الأمانی کی طرح برتنے پر اکتفا کریں اور بس۔

اہل یہود کے یہاں اب یہ ایک مسلّمہ امر ہے کہ دین کی تشریحات تلمودی ادب میں موجود ہیں۔ انھوں نے تورات کے معانی کو وسعت دے کر تشریحی، تعبیری اور فقہی ادب کو زبانی تورات میں شامل کرلیا ہے۔ اب ان کے یہاں خمسہ موسوی کی حیثیت تقدس اور تبرک کے حوالے سے ہے، ورنہ اصل کتاب ہدایت تو تلمود ہے۔ ہمارے یہاں بھی بدقسمتی سے قرآن کو کتاب ہدایت کے بجائے کتاب امانی میں تبدیل کردیا گیا ہے۔ مسلمانوں میں آیات قرآنی کے انتخابات کے ایسے مجموعے خاصے مقبول ہیں جن میں مختلف سورتوں کی ترتیل پر کثرت ثواب کی بشارت سنائی گئی ہے۔ انہی مجموعوں میں ایسی روایتوں کی بھی کثرت ہے جس میں معمولی معمولی نیکی پر جنت میں ہزاروں ہزار محلوں کی بشارت موجود ہے۔ محدثین نے فضائل کے سلسلے میں احادیث قبول کرنے میں بڑی سہل پسندی سے کام لیا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ قرآنی وحی کے مقابلے میں خودساختہ اوراد و وظائف کے ذریعہ جنت تک پہنچنا آسان ہوگیا ہے۔ بعض روایتوں نے قرآن کو کتاب ہدایت کے بجائے کتاب حفاظت میں تبدیل کردیا ہے۔ بخاری کی ایک روایت ہے کہ جو شخص سوتے وقت آیت الکرسی پڑھے تو اس پر خدا کی جانب سے ایک محافظ مقرر کردیا جاتا ہے اور اس طرح اس کا مال چوری سے محفوظ رہتا ہے[11] حد تو یہ ہے کہ بعض وضعی حدیثوں کے مطابق ''**من ولد له مولود فسماه محمدا كان هو والوالد في الجنة**'' کسی نے کہا کہ ''**من قال لا اله إلا الله اعطى في**

الجنة سبعين الف مدينة، في كل مدينة سبعون الف قصر، في كل قصر سبعون الف حورا'' کسی نے کہا کہ جو شخص جمعہ کے دن سورۂ کہف پڑھے گا وہ دجال کے فتنے سے محفوظ رہے گا۔[۱۲] یہ اور اس قسم کی روایات نے وحی کے گرد فضائل کا ایک ایسا حصار کھینچ دیا جس کا عبور کرنا عام انسان کے لئے مشکل ہوگیا۔ بعض حضرات نے قرآنی سورتوں کے خواص دریافت کئے اور ان کی بنیاد پر نقوش قرآنی کا سفلی طریقہ رائج کردیا۔ کسی نے کہا کہ اگر ویران باغ میں سورۂ مریم کا نقش باندھ دیا جائے تو اس کی بہار لوٹ آئے گی۔[۱۳] اس طرح کے غیر اسلامی بلکہ کافرانہ عملیات اور سفلی طریقوں نے وحی قرآنی کو اعمال قرآنی میں محدود کردیا اور اس طرح امتِ مامور کے ہاتھوں سے لوحِ محفوظ والی کتابِ ہدایت دیکھتے دیکھتے نکل گئی۔ فتنین کی یہ کتاب تو اس کے پاس اب بھی محفوظ ہے، لیکن عوام کے لئے اس کا استعمال فضائل قرآنی اور اعمال قرآنی کی حیثیت سے ہے، کتاب ہدایت کی حیثیت سے نہیں، کہ کتاب ہدایت کی اجارہ داری یا اس کی تشریح وتعبیر کا حق جن لوگوں کے لئے مخصوص سمجھا گیا ہے، وہ اب اس دنیا میں نہیں پائے جاتے۔ فہم قرآنی اور تعبیر وتشریح کا تمام کام، یہ سمجھا جاتا ہے کہ متقدمین کے ہاتھوں انجام پاچکا ہے: **ان الاوائل لم یترکوا لاواخر شیئاً**. جمہور مسلمانوں کا کام ائمہ اربعہ کی تقلید اور غیر مقلدین کے یہاں صحاح ستہ کے مصنّفین پر غیر معمولی اعتماد۔ یہی سب کچھ وہ مذہبی سرمایہ ہے جو متقدمین کے حوالے سے ہمیں حاصل ہے، وحی تک براہِ راست رسائی اس طریقۂ تعلیم نے عملاً ناممکن بنادیا ہے۔[۱۴]

اہل یہود کی شریعت تلمود جسے تخصیص کے ساتھ حلاقہ کہنا چاہئے، کی طرح ہمارے یہاں بھی یہ خیال عام ہے کہ مجتہد نے قرانی وحی سے تمام ممکنہ مسائل کا استنباط اور استخراج کرلیا ہے، اس لئے عام لوگوں کے لئے فقہ کی مدون کتابوں میں رہنمائی کے لئے کافی سامان دستیاب ہے۔ اس عمل نے کتاب کو اگر منسوخ نہیں کیا تو کم از کم اس سے بڑی حد تک لوگوں کو بے نیاز کردیا۔ مجتہد کے لئے سخت شرائط اور کتاب سے راست رجوع کے لئے جس طرح جامع العلوم ہونا شرط قرار دیا گیا۔ اس نے بڑی حد تک وہی صورت حال پیدا کردی جس کی کوشش علمائے یہود وحی موسوی کے سلسلے میں عملاً کر چکے تھے۔ ان کے کہنا تھا کہ ''تلمود کے بغیر ہم بائبل کے اقتباسات نہیں سمجھ سکتے'' انھوں نے یہ عقیدہ گھڑ لیا تھا کہ ''بائبل کی تشریح کا حق خدا نے متقدمین یا بزرگوں کو دے رکھا ہے اور یہ کہ روایات کی اتنی ہی اہمیت ہے جتنی کہ خود مصحف وحی کی''۔[۱۵] دوسری طرف متقدمین نے بھی اپنے طور پر یہ اصول وضع کرلیا کہ جو شخص تلمود کے مطالعے سے اعراض کرے اسے مصحف کا فہم حاصل نہیں ہوسکتا۔ Pirke Avot، جسے مشناۃ میں تقریباً دوسو پچاس

عیسوی میں داخل کیا گیا، میں باضابطہ اس بات کی صراحت موجود ہے کہ تورات کے گرد اس کی حفاظت کی خاطر ایک حصار بنایا جائے۔ اقوال بزرگان (Chapters of the Fathers) اس طرح شروع ہوتا ہے:
''موسیٰ کو سینائی پر تورات دی گئی جس نے اسے حضرت یوشع کو، یوشع نے بزرگوں کو، بزرگوں نے انبیاء (کاہنوں) کو اور پھر کاہنوں نے اسے عظیم اسمبلی کے سپوتوں کے حوالے کر دیا۔ انھوں نے تین باتوں کی تاکید کی، فیصلے میں انصاف کرو، شاگردوں کی نسل تیار کرو اور تورات کے گرد ایک حصار بناڈالو''[۱۶]۔

تلمودی ادب دراصل تورات کے گرد بنایا جانے والا یہی وہ مضبوط حصار ہے جس کے بغیر اب تورات کی کسی بھی تفہیم کو اعتبار حاصل نہیں۔ دیکھا جائے تو یہ تقریباً وہی عمل ہے جو ہمارے یہاں فقہائے عظام اور مجتہدین کے ہاتھوں قرآنی وحی کے ساتھ ہوا ہے، جس طرح تلمودی ادب کے بغیر تورات کا کوئی فہم مستند نہیں ہوسکتا، اسی طرح متقدمین اور سلف کے طریقۂ تعبیر سے الگ فہم قرآنی کے کسی اور طریقے کو اعتبار حاصل نہیں۔ گزشتہ مباحث میں ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ وحی سے براہ راست اکتساب فیض کے لئے علمائے متقدمین نے کتنی سخت شرائط عائد کی ہیں اور اسے صرف مجتہد کا حق قرار دیا ہے، جس کے لئے کتاب وسنت کے علم کے علاوہ ناسخ ومنسوخ کا علم اور اجماع سابقہ سے واقفیت بھی ضروری قرار دی گئی ہے۔ رہی یہ بات کہ منسوخ آیتوں کا علم کس طرح حاصل کیا جائے تو اس بارے میں غزالی نے ان قدیم کتب کی طرف اشارہ کیا ہے جن میں ان مسائل پر تفصیلی بحث موجود ہے۔ اسی طرح مجتہد کے لئے یہ بھی ضروری قرار دیا گیا ہے کہ وہ اپنے اجتہاد سے پہلے یہ ضرور دیکھے کہ اس کا یہ عمل اجماع سابقہ کے خلاف تو نہیں۔ ائمہ اربعہ میں سے کسی کے یہاں سے اس کے خیال کی حمایت ہوتی ہے یا نہیں[۱۷]۔ دیکھا جائے تو مجتہد کو وحی سے اکتساب کی جو آزادی ایک ہاتھ سے دی گئی ہے اسے دوسرے ہاتھ سے یہ کہہ کر چھین لیا گیا ہے کہ اجماع سابقہ کے خلاف اس کا اجتہاد قابل قبول نہیں ہوسکتا، اسی طرح ناسخ ومنسوخ کی بحث کے لئے قدیم مجتہدین کی کتابوں کو ماخذ اور فیصلہ کن اہمیت دے کر عملاً قرآنی وحی کی ہر تعبیر وتفہیم کو قدماء کے فہم کا تابع بنادیا گیا ہے۔ گویا روایات اور تاریخ کے ذریعے قرآنی وحی کو قید کرنے کی کوشش میں جو کسر رہ گئی تھی اس رہی سہی کسر کو فقہ نے پورا کر دیا۔

تورات، جس کے لفظی معنی قانون کے ہیں، اہل یہود کے لئے کتاب احکام کی حیثیت رکھتی تھی۔ علمائے یہود نے ان صریح احکام سے اعراض برتنے کے لئے **اولاً** تو یہ عقیدہ گھڑا کہ اس کے بالمقابل زبانی تورات کی بھی اسی قدر اہمیت ہے جو سینہ بہ سینہ بزرگوں کے ذریعہ ان تک پہنچی ہے۔ **ثانیاً** اس کتاب احکام

سے احکام کی تخریج وتعبیر کا ایک مکمل فن وجود میں آ گیا، جس میں وحی سے کہیں زیادہ علمائے یہود کی اپنی تعبیرات کو دخل تھا۔ اس ربائی لٹریچر کو تقدس عطا کرنے کے لئے اسے تفقہ اور تدبر سے تعبیر کیا گیا اور تحریری تورات کے مقابلے میں اس کی اہمیت مسلم کرنے کے لئے یہاں تک کہہ دیا گیا کہ مذہب یہود کی تمام تر تعلیمات اور اس کی تشریحات کے مآخذ دراصل طور پر جلوہ گر ہونے والی ''روشنی'' اور ''صدا'' میں واقع ہے[۱۸] اور یہ کہ مستقبل میں پوچھا جانے والا اب کوئی ایسا سوال نہیں ہے جس کے بارے میں موسیٰ کو سینائی پر بتایا نہ گیا ہو۔ اور چونکہ روشنی اور صدا کے حوالے سے وحی کی تعبیر میں خاصی گنجائش پیدا ہوگئی تھی، اس پر طرہ یہ کہ زہاری تصوف کے حوالے سے ہر وحی کی ستر تعبیریں ممکن ہوگئیں[۱۹]۔ تورات کے گرد ربائی طریقۂ تفہیم کے حصار نے اب عام لوگوں کے لئے ایک ہی راستہ کھلا رکھا، وہ یہ کہ تلمود میں وحی کی جو تشریح موجود ہے اس پر اکتفا کرلیا جائے اور بس۔ اور چونکہ ان تشریحات کا ایک قابل ذکر حصہ مسائل و احکام سے متعلق تھا اس لئے عملی طور پر اہل یہود اپنی تاریخ میں تورات سے بڑی حد تک بے نیاز ہوگئے۔ تلمود ان کی زندگی کا مرکز ومحور بن گیا۔ آج بھی مخصوص مذہبی دنوں میں یا سیناگاؤگی کی اسمبلی میں خمسہ موسوی کی حیثیت صرف کتاب تلاوت کی ہے جسے ازراہِ برکت پڑھا جاتا ہے، ورنہ رہنمائی کے لئے تلمود کا وسیع فقہی لٹریچر کافی سمجھا جاتا ہے۔

ہم مسلمان اصولی طور پر تو اپنے آپ کو قرآنی وحی سے بے نیاز نہیں سمجھتے، کہ اب بھی جمہور مسلمانوں میں قرآن بحیثیت کتاب ہدایت ایک مسلمہ خیال ہے، البتہ عملی زندگی میں ائمہ اربعہ کے فقہی حصار نے راست رجوع کا دروازہ بند کررکھا ہے۔ اس کیفیت کو ہمارے یہاں ''اجتہاد کا دروازہ بند'' ہے جیسے بیان سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ گوکہ علماء میں شروع سے ہی اجتہاد کے حامیوں کا ایک قابل ذکر گروہ رہا ہے لیکن عملی طور پر اجتہاد کے یہ علمبردار بھی صرف فروع میں اجتہاد کو روا سمجھتے ہیں۔ یہ خیال کہ ائمہ اربعہ کے تفقہ و تدبر سے بلند ہوکر اب بھی وحی کی جلوہ سامانی ہماری گم کردہ راہ کو منور کرسکتی ہے، ایک ایسا خیال ہے جس کی کم ازکم راسخ العقیدہ مسلم فکر میں گنجائش نہیں رکھی گئی ہے۔ وحی کی تفہیم اور اس کا اظہار جتنا کچھ ائمہ اربعہ کے یہاں ہوا ہے، اگر صرف اسی کو انسانی اکتساب وحی کا کمال سمجھا جائے اور اس سے آگے راست اکتساب کی کوئی شکل ممکن نہ ہو تو یہی سمجھا جاسکتا ہے کہ اس فقہی لٹریچر نے امت کو قرآنی وحی سے بے نیاز کردیا ہے۔ جذباتی طور پر اس صورت حال کو قبول کرنا شاید ممکن نہ ہو لیکن یہ ایک ایسی مسلمہ حقیقت ہے جس پر صدیوں کا فقہی ذخیرہ گواہ ہے۔

حیرت ہوتی ہے کہ اہل یہود کی طرح فقہ کے ارتقاء میں اور وحی کے گرد انسانی حصار بنانے کے عمل میں اس قدر مماثلت کیوں کر ہے۔ اس کی ایک وجہ تو شاید یہ ہوسکتی ہے کہ ایک امت پر دوسری امت کے تہذیبی اثرات پڑتے رہے ہیں لیکن دوسری اور اس سے بھی اہم وجہ یہ ہے کہ انسانی ذہن اپنی تمام تر تابنا کی کے باوجود لامتناہی وحی کو اپنی ذہنی سطح پر codified یعنی مدوّن انداز سے دیکھنا چاہتا ہے۔ وحی بنیادی طور پر ایک ایسی روشنی ہے جو ہماری راہ کے علاوہ قلب ونظر کو روشن کرتی ہے، قلب مومن کے لئے وحی کے مطالب کا سمجھنا اور اس راہ پر چل نکلنا ایک فطری اور آسان عمل ہوتا ہے، البتہ اگر وحی کو کتاب احکام کی حیثیت دینے کی کوشش کی جائے تو پھر رفتہ رفتہ انسانی فہم کا حصار اسے صرف ڈوز اور ڈونٹ (Do's & Don'ts) کی فہرست میں تبدیل کردیتا ہے۔ عہد رسول ﷺ میں لوگوں کی نگاہیں مطالب وحی پر تھیں اس کے form پر نہیں۔ اسامہ بن شریک جو حج میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے، ان سے روایت ہے کہ لوگ آپؐ کے پاس آتے۔ کوئی کہتا: یا رسول اللہ میں نے طواف سے پہلے سعی کرلیا، کوئی کہتا: میں نے فلاں چیز پہلے کرلی، میں نے فلاں چیز بعد میں کی۔ آپ ﷺ کا جواب ہوتا: ''اس میں کوئی حرج نہیں۔ حرج کی بات اور ہلاک کرنے والی بات تو یہ ہے کہ کوئی شخص اپنے مسلمان بھائی کی عزت پر حملہ کرے۔''[۲۰] لیکن جب وحی کو کتاب الاحکام کی حیثیت سے برتنے کا رواج چل نکلا اور ان آیات کی نشان دہی ہونے لگی جس سے احکام برآمد ہوتے ہوں، اور جب احکام القرآن پر کتابیں ترتیب پانے لگیں تو وحی کو Thou shalt not do کا مرادف سمجھ لیا گیا، جس کے استنباط اور استخراج کے لئے فقہاء کی مجلسیں آباد ہوگئیں۔ قرآن میں اہل یہود کے اس رویے کی تنبیہ کی گئی ہے کہ وہ غیر ضروری سوالات سے اصل مسئلے سے توجہ ہٹاتے اور خود اپنے لئے مشکلیں پیدا کرتے ہیں۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ وحی کی طرف اس عہد کے علماء اپنے عہد کو منور کرنے کے لئے رجوع کرتے، لیکن اس کے برعکس ہوا یہ کہ وہ تمام سوالات قائم کئے گئے اور عجیب وغریب، نامعلوم اور غیر موجود صورت حال کے لئے بھی مسائل کے استنباط کو فقہاء نے اپنے دائرۂ کار میں شامل کرلیا۔ کوشش کی گئی کہ کوئی ایسا مسئلہ اس آسمان کے نیچے ایسا نہ رہے جس کا مدوّن جواب ان فقہاء کی مجلسوں سے تیار نہ کرلیا گیا ہو۔ وحی کو اخلاقیات اور احکام کی سطح پر اتارنے سے بڑی پیچیدگیاں پیدا ہوگئیں اور وہ وہ فقہی اختلافات رونما ہوئے جن سے اب تک اس امت کو نجات نہیں مل سکی ہے اور شاید اس وقت تک نہ مل سکے جب تک ان مدون فقہ کے سلسلے میں تنقیدی نقطۂ نگاہ پیدا نہ ہو، اور جب قرآنی وحی سے راست اکتساب ہمارے لئے ممکن ہوسکے۔

ہم یہ عرض کررہے تھے کہ اہل یہود کی طرح ہمارے یہاں بھی حیرت انگیز مماثلت پائی جاتی ہے۔ یہ بات بھی محل نظر رہے کہ گو کہ یہودی ربائی اور مسلم علماء دونوں کا منصب مذہبی اعتبار سے غیر متعین ہے۔ عیسائی پادریوں کے برخلاف اسلام اور یہودیت میں علماء کا کوئی باضابطہ ادارہ تسلیم شدہ نہیں ہے، لیکن اس کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ ان دونوں مذاہب میں مذہبی فکر کی تعبیر اور اس کے تعین میں علماء نے اپنا رول محفوظ کرلیا ہے۔ عالم بنانے اور اس کو اعتبار بخشنے کا عمل بھی دونوں روایتوں میں بڑی مماثلت رکھتا ہے۔ جس طرح یہودی ربائی اپنے شاگرد کو سمیخہ (Semikha) عطا کرکے اسے سند بخش سکتا ہے اسی طرح ہمارے یہاں بھی نئے تربیت یافتہ عالم کو پرانے استاد کے ہاتھوں درس و تدریس اور ارشاد وتعلیم کے لئے اجازۃ عطا کرنا اسے اعتبار بخش دیتا ہے۔ مشائخیت کو ایک ادارے کی حیثیت سے نہ تو یہودیت میں کوئی حیثیت حاصل تھی اور نہ ہی اسلام میں کسی کہانت یا پاپائیت کی گنجائش رکھی گئی تھیں، لیکن تلمود کو تقدس عطا کرنے والوں کے لئے یہ لازم تھا کہ وہ تلمودی مصنّفین کو بھی غیر معمولی تقدس اور تفقہ کا حامل بتائیں۔ لہٰذا تلمود میں اہل یہود کی مذہبی قیادت کو تقدس کا درجہ دینے کے لئے فقیہ وقت کو موسیٰ، ہارون اور سموئیل نبی کا ہم منصب بتایا گیا اور اہل یہود سے یہ مطالبہ کیا گیا کہ جس طرح ان انبیاء کی اتباع تم پر لازم ہے اسی طرح موجودہ مذہبی قیادت بھی ان کی اتباع کی حقدار ہے[۲۱] ہمارے یہاں بھی فقہی ادب کی وہ حیثیت نہ ہوتی اگر خود ان فقہاء کو خصوصی تقدس اور تفقہ کا حامل قرار نہ دیا جاتا۔ لہٰذا ہمارے یہاں بھی اس قسم کے تصورات عام ہوئے کہ شیخ اپنی قوم میں اسی طرح ہے جیسے کہ نبی اپنی امت میں: ''**الشيخ في قومه كالنبي في امته**''۔ ایک حدیث کے حوالے سے یہ بات کہی گئی کہ ہماری امت کے علماء بنی اسرائیل کے انبیاء کی مانند ہیں۔ کسی نے کہا کہ جو شخص اللہ کے پاس بیٹھنا چاہتا ہے تو اسے اہل تصوف کے پاس بیٹھنا چاہئے۔ اس طرح عملی طور پر یہودیت کی طرح اسلام میں بھی مقدس علماء کا ایک ادارہ وجود میں آ گیا جسے وحی کی تعبیر وتشریح میں مستند ماخذ کی حیثیت حاصل ہوگئی۔

یہ بات وثوق کے ساتھ کہنا تو مشکل ہے کہ اسلامی اصول فقہ پر تلمودی ادب کے اثرات کس حد تک مرتب ہوئے ہیں البتہ تاریخی طور پر یہ بات مسلّم ہے کہ ابتدائی صدیوں میں نظام مملکت کے اصول جس طرح مرتب ہوئے ہیں اس میں مروّجہ رومی اور ایرانی طریقۂ تنظیم مملکت مثلاً خراج کی وصولی اور اس کے مروّجہ طریقوں سے نہ صرف یہ کہ اکتساب کیا گیا بلکہ اس کی ناانصافیوں کو دور کرکے اسے برقرار رکھنے کی کوشش کی گئی۔ حضرت عمرؓ کے عہد میں دوسرے انتظامی ماڈل سے اکتساب کا صحت مند اور تنقیدی رجحان

پایا جاتا تھا۔ یہودی علماء جن کے یہاں تلمود کی تدوین کا کام مکمل ہو چکا تھا اور جو زبانی اور تحریری تورات کے تطابق کے فن میں ماہر تھے اور جن کے یہاں چھوٹے چھوٹے مسئلے پر بحث وتمحیص اور قیل وقال کی ایک روایت موجود تھی، ان کے قبول اسلام سے اس طریقۂ تطبیق کا نئے مذہب میں آنے کا خیال عبث نہیں ہے۔ بعد کی صدیوں میں جب بغداد کی عباسی خلافت یہودی اسکالرشپ کا گہوارہ بن گئی تھی، خود فقہ اسلامی کے اثرات اہل یہود کی مذہبی فکر پر صاف محسوس کئے جاتے تھے۔ Moses Memonides جو عہد عباسی کا پروردہ ہے اور جسے جدید یہودی فکر میں سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے، اس کے طریقۂ تطبیق پر مسلم فقہی methodology اور اس عہد کی مسلم فلسفیانہ موشگافی کی چھاپ بڑی نمایاں ہے، اس لئے ہم اس امکان کو قطعی نظر انداز نہیں کر سکتے کہ ابتدائے عہد میں مسلم فقہی methodology پر نومسلم یہودی علماء نے اپنے اثرات نہ ڈالے ہوں۔ فقہ کے لئے شریعت کا لفظ حلاقہ کے ہم معنی ہے جس کا معنی ہے راستہ۔ تدوین فقہ میں روایات جسے زبانی تورات یا وحی غیر متلو کی حیثیت رہی ہے اس کی جانب ہم پہلے ہی اشارہ کر چکے ہیں۔ کتاب وسنت کے بعد اجماع کو کلیدی حیثیت دینا تلمودی ادب میں بنیادی قدر کی حیثیت سے ایک معروف طریقۂ کار ہے۔ اجماع یعنی رائے عامہ کو تلمود میں اس قدر حیثیت حاصل ہے کہ بعض اوقات اس سے نص میں بھی تبدیلی آ جاتی ہے[۲۲]۔ ہمارے یہاں بھی اجماع کو تقدس عطا کرنے کے لئے یہ بات کہی گئی کہ محمدؐ کی امت گمرہی پر جمع نہیں ہوسکتی۔ اسی طرح استحسان یا مصالح امت تلمودی علماء کے نزدیک اصول فقہ میں ایک کلیدی قدر کی حیثیت رکھتا ہے۔ کچھ یہی حال عرف وعادات کا ہے جس کی تلمود میں اس قدر اہمیت ہے کہ (custom annuls law) رسم ورواج اور عرف وعادات نص کو تبدیل کر سکتے ہیں یا کم از کم وقتی طور پر احکام شرع کو معطل کرنے کا حق رکھتے ہیں۔

ایک اہم اور حیرت انگیز مماثلت ان دو روایتوں میں فقہی لٹریچر کو تقدس فراہم کرنے کے سلسلے میں ہے۔ تلمود کی طرح ہمارے یہاں بھی ائمہ اربعہ کا تفقہ اور ان کی مدوّن فقہ تنقید واحتساب سے بالاتر ایک طرح کا تقدس لئے ہوئے ہے۔ بعد کے فقیہوں کے لئے صرف یہ کافی سمجھا گیا ہے کہ وہ متقدمین کی کتابوں پر تشریحی حاشیے لکھیں اور ان کے چراغوں سے اپنا چراغ روشن رکھیں۔ ابتدائی تین چار صدیوں میں وحی پر غور وفکر کا جو کام ہوا ہے اسے مستند اور حرف آخر سمجھ لیا گیا ہے۔ یہودی روایت میں کچھ یہی مقام Tannaim کو حاصل ہے جن کے سر تورات کی تشریح وتعبیر کے اصول وضع کرنے کا سہرا ہے اور جن کے بارے میں یہ خیال عام ہے کہ وہ اپنے علم اور تفقہ کی بنیاد پر تورات پر اجتہادی نگاہ ڈال سکتے تھے۔ غور وفکر

کے بعد انھوں نے حلاقہ کی شکل میں جو سرمایہ چھوڑا ہے اسے یہودی حلقوں میں غیر متبدل اور حرف آخر استخراج سمجھا جاتا ہے، اس کے بعد Amoraim کا سلسلہ ہے جسے Saboraim کی درمیانی کڑی کی حیثیت حاصل ہے۔ بعد کی دونسلیں گوکہ تقدس کے ہالے میں گھری نظر آتی ہیں لیکن ان کی تمام تر ذہنی کاوشیں Tannaim کی رہین منت ہیں۔ بعد کی دونسلوں کو Tannaim کی سی حیثیت تو حاصل نہیں البتہ انھیں بھی حلاقہ یعنی شرع موسوی کی تدوین میں بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ تین نسلوں پر محیط اس دور کو خاص تقدس عطا کرنا تقریباً وہی عمل ہے جو ہمارے یہاں ائمہ مجتہدین کے حوالے سے معروف ہے[۲۳] یا جس کی کسی حد تک گونج ''ثم الذین یلونھم ثم الذین یلونھم'' کی مفروضہ حدیث میں سنائی دیتی ہے۔ ابتدائی دو صدیوں میں تدوین فقہ کے لئے رجوع الی کتاب وسنت کا تخلیقی رویہ اگلی صدیوں میں منجمد ہوجاتا ہے، بعد کے لوگوں کو تقلید کے علاوہ کوئی اور محفوظ راستہ نظر نہیں آتا۔ بعد کے فقہاء ان چار مکاتب فکر میں سے کسی ایک سے وابستہ کرنے پر خود کو مجبور پاتے ہیں۔ ان کا کام انہی ائمہ اربعہ میں سے کسی ایک کے مکتبہ فکر کو مزید ترقی واشاعت دینا قرار پاتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تفقہ وتدبر کی سخت شرائط نے دونوں روایتوں میں وحی کے گرد جو حصار کھینچا تھا اسے توڑنا گزرتے وقتوں کے ساتھ ناممکن ہوتا گیا اور عملاً خمسہ موسوی کی طرح قرآنی وحی بھی محض کتاب احکام میں محدود (reduce) ہوکر رہ گئی۔

فقہ نہ صرف یہ کہ احکام کے استخراج کا کامل نمونہ قرار پاگئی بلکہ بسااوقات ایسا بھی ہوا کہ انسانی تشریح وتعبیر نے اصل وحی کے مطالب پر پردہ ڈال دیا۔ مثال کے طور پر اہل یہود کی روایت کو لیجئے یہاں تورات میں صراحت کے ساتھ سبت کے دن کاموں کی ممانعت آئی تھی۔ سختی سے اس بات کی تاکید کی گئی تھی کہ سبت کو کام کاج سے فارغ رکھا جائے، لیکن فقہائے یہود نے ان کاموں کی بھی ایک فہرست مرتب کرڈالی جسے کام قرار دیا جاسکتا تھا۔ تلمود میں ان چالیس کاموں کی ایک فہرست گنائی گئی ہے جس میں ہتھوڑے چلانے سے لے کر کسی چیز کا ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنا بھی شامل ہے۔ بظاہر تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کاموں کی یہ تخصیص اور فہرست سازی سبت کے احکام کو انسانی سطح پر تمام امکانات کے ساتھ برتنے کے لئے بنائی گئی ہے لیکن جب ایک ایک کام کی مزید تفصیل پر مباحث شروع ہوتے ہیں تو خود ان مباحث میں رخصت کی بڑی گنجائش نکل آتی ہے۔ مثال کے طور پر سامان کی منتقلی کے سلسلے میں مشناۃ میں جو تفصیلات وارد ہوئی ہیں اسے چار طریقے سے سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ کسی چیز کا ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانا چار صورتوں کو جنم دے سکتا ہے۔ مثلاً اگر کوئی فقیر گھر کے باہر کھڑا ہو اور صاحب خانہ گھر کے

اندر ہو اور فقیر اپنا ہاتھ گھر کے اندر داخل کرے اور اس طرح صاحب خانہ کے ہاتھ میں کوئی چیز منتقل کر دے یا اس سے کوئی چیز وصول کرے اور پھر اپنا ہاتھ باہر نکال لے ایسی صورت میں فقیر کو سبت کے محرمات کا مرتکب سمجھا جائے گا اور صاحب خانہ پر کوئی گناہ لازم نہ آئے گا۔ اس کے برعکس اگر صاحب خانہ اپنا ہاتھ باہر نکال کر فقیر کے ہاتھ پر کچھ رکھ دیتا ہے یا اس سے کچھ لے کر اپنا ہاتھ واپس اندر کر لیتا ہے تو ایسی صورت میں صاحب خانہ گنہ گار سمجھا جائے گا، فقیر پر کوئی گناہ نہ آئے گا۔ البتہ اگر فقیر اپنا ہاتھ گھر میں داخل کرے اور پھر صاحب خانہ کچھ اس میں سے لے لے یا اس میں کچھ ڈال دے تو ایسی صورت میں دونوں گناہ سے بچ جائیں گے۔ اسی طرح اگر صاحب خانہ اپنا ہاتھ باہر نکالے فقیر اس میں سے کچھ لے لے یا اس میں کچھ رکھ دے اور پھر صاحب خانہ اپنا ہاتھ اندر کرے تو ایسی صورت میں دونوں گنہ گار ہوں گے۔[۲۴] تورات کے ایک سیدھے سادے حکم پر فقہی موشگافیوں کے اس طریقے نے نہ صرف یہ کہ اس مسئلے کو پیچیدہ بنا دیا بلکہ ایسے طریقے کی بھی نشاندہی کر دی جس کو بروئے کار لا کر دونوں فریق گناہوں سے بچ سکتے ہیں۔ دیکھا جائے تو یہ تفقہ کے پردے میں احکام کی تنسیخ کا ایک مذموم طریقہ کار ہے۔ ہمارے یہاں بھی فقہ کی کتابوں میں حیل کے حوالے سے اس قسم کی بحثوں کا وافر بیان موجود ہے۔ ہم یہاں مثال کے لئے صرف امام غزالی کی کتاب ''کیمیائے سعادت'' سے ایک مثال پیش کرتے ہیں۔ امام موصوف اس بات کے قائل ہیں کہ جھوٹ بولنا حرام ہے کہ یہ دل پر اثر کرتا اور اسے تاریک کر دیتا ہے۔ البتہ کوئی آدمی اگر اس طرح جھوٹ بولے کہ وہ از راہ مصلحت ہو اور دل سے اسے مکروہ سمجھتا ہو تو پھر حرام نہیں۔ اس لئے کہ بقول امام موصوف وہ جب خیر کے ارادے سے جھوٹ بولے گا تو دل تاریک نہ ہوگا۔[۲۵] امام شعبی کے حوالے سے آپ نے لکھا ہے کہ حضرت شعبی کو جب کوئی بلاتا تو لونڈی کو فرماتے کہ دروازہ میں ایک دائرہ کھینچ کر اس کے بیچ میں انگلی رکھ کر کہہ دو کہ حضرت یہاں نہیں ہیں۔ یا پھر کہہ دو مسجد میں تلاش کرو۔[۲۶] بعض لوگوں نے اس فعل کو وسعت دے کر بعض فرائض میں بھی اپنے لئے تخفیف کی راہ ہموار کر لی۔ اکبر کے دربار میں معروف عالم دین مخدوم الملک عبداللہ سلطان پوری کا اپنے آپ کو زکوٰۃ سے مستثنیٰ قرار دینے کے لئے سال کے آخر میں اپنی تمام دولت بیوی کے نام ہبہ کرنے اور پھر اسے زبانی ہبہ کے ذریعہ واپس لوٹانے کا عمل اس حیلے کی بہترین مثال ہے جس کے ذریعہ عین فقہی طریقۂ کار سے مقاصد شرع کو معطل کیا جانا ممکن ہے۔

وحی کے گرد فقہ کے حصار نے نہ صرف یہ کہ دین کو کتاب احکام بنا کر رکھ دیا بلکہ انسانی فہم کو تشریح و تعبیر کا کلی حق دینے اور استنباط کے انسانی طریقۂ کار کو unfailing اور فائنل سمجھ لینے کے نتیجے میں مختلف

طریقۂ کار نے، اور بعض اوقات ایک ہی طریقۂ کار نے، مختلف قسم کے مباحث کو جنم دیا جس سے بسا اوقات سخت قسم کے فقہی اختلافات پیدا ہوگئے۔ ایک ہی مسئلے پر مختلف فقہاء کے یہاں متضاد اور متحارب رائے پائی گی۔ عام لوگوں کے لئے یہ سمجھنا مشکل ہوگیا کہ خدا کا اصل حکم کون سا ہے؟ قرآن کو واقعی کیا مطلوب ہے؟ جس طرح تلمود میں ایک ہی مسئلے پر مختلف آراء کا پایا جانا اہل یہود کو خاص رحمت اور عافیت معلوم ہوتا تھا کہ ان کے لئے اس طریقۂ کار سے وحی میں اپنی پسند کا خیال دریافت کرنا آسان ہوگیا تھا۔ تقریباً وہی صورت حال ائمہ اربعہ کی فقہ میں پیدا ہوگئی۔ مثال کے طور پر تعلیم نسواں کے مسئلے پر ایک تلمودی عالم کا خیال ہے کہ ہر شخص پر اپنی بیٹیوں کو تورات کی تعلیم دینا لازمی ہے۔ لیکن دوسرا فقیہ کہتا ہے کہ جو شخص اپنی بیٹی کو تورات کی تعلیم دیتا ہے وہ گویا اسے فحاشی سکھاتا ہے۔ ایک یہودی فقیہ کا خیال ہے کہ تورات کے اس جملے Ye shall teach them your children (Deut XI-19) کا مطلب صرف لڑکوں کی تعلیم ہے، لڑکیوں کی نہیں۔ اور یہ کہ تورات کے الفاظ، بہتر ہے کہ آگ میں جلا دیئے جائیں بجائے اس کے کہ اس کی تعلیم عورت کو دی جائے۔[۲۷] اس قسم کے متضاد خیالات میں دونوں رائے تو یقیناً تورات کی نہیں ہوسکتی، البتہ اس طریقۂ کار میں یہ سہولت ضرور موجود ہے کہ ہر شخص اپنی پسند کی رائے تلمود سے اخذ کرسکتا ہے۔ عورت کی تعلیم کا قائل بھی تلمود کا سچا پیرو ہے اور جو اس کی مخالفت کرے وہ بھی۔[۲۸] اسی طرح اگر کوئی شخص اپنی بیوی سے جنسی تعلقات منقطع کرنے کی قسم کھالے تو شمائی مکتب فکر کے مطابق اسے دو ہفتے میں رجوع کرلینا چاہئے، اگر وہ رجوع کرنا چاہتا ہو۔ لیکن حلل کا مکتب فکر ایک ہفتہ سے زیادہ مہلت نہیں دیتا۔[۲۹] تورات میں طلاق کے جواز میں یہ بتایا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی کی آنکھ میں الفت ومحبت کی کوئی رمق نہ دیکھے اور اس میں indecency پائے تو وہ اسے طلاق دے سکتا ہے۔[۳۰] مشناۃ میں اس حکم پر جو تشریح ملتی ہے وہ اس سارے اصول کو خاصا پیچیدہ بنادیتی ہے۔ شمائی مکتب فکر کے مطابق جب واقعتاً کسی indecency کا صدور نہ ہو طلاق کے بارے میں نہیں سوچنا چاہئے۔ لیکن اس کے برعکس Hillel کے مکتب فکر کا کہنا ہے کہ اگر وہ کھانا پکانے میں بدسلیقگی کا مظاہرہ کرے تو اسے بھی indecency میں شمار کیا جائے گا۔ اس سے بھی آگے بڑھ کر ربائی اکیوا (Akiva) تو اس مفہوم کو یہاں تک وسعت دیتے ہیں کہ اگر اس سے کوئی دوسری خوبصورت عورت دستیاب ہوجائے تو اس کی بدصورتی بھی indecency میں شمار کی جائے گی اور مرد کے لئے طلاق کا جواز فراہم ہوجائے گا۔[۳۱] یہ اور اس قسم کے اختلافات خود ہماری فقہ کی کتابوں میں وافر مقدار میں موجود ہیں۔ احناف کے یہاں اگر تین طلاق معاشرتی زندگی کا انقطاع کردیتی

ہیں تو اہل حدیث کے نزدیک ان کی حیثیت صرف ایک طلاق کی ہے، جس سے معاشرتی زندگی کے احیاء کا امکان برقرار رہتا ہے۔ حتیٰ کہ فرض نمازوں کی ادائیگی میں بھی ائمہ کی فقہ نے سخت اختلافات پیدا کردئے ہیں۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک فرض نماز کی صرف پہلی رکعتوں میں قرأت فرض ہے لیکن امام شافعی کے نزدیک تمام رکعات میں قرأت فرض ہے، اس کے برعکس امام مالک پہلی تین رکعتوں میں قرأت فرض قرار دیتے ہیں جبکہ حسن بصری کے نزدیک صرف پہلی رکعت میں قرأت فرض ہے، وغیر ذالک۔ فقہی تعبیروں میں جس کا جی چاہے اپنی پسند کے امام اور اپنی پسند کی تعبیر کو اختیار کرے۔ البتہ بعض علماء اس بات کی شرط لگاتے ہیں کہ رخصت کی خاطر مختلف مکاتب فکر سے مختلف چیزوں کا انتخاب مناسب نہیں۔ ان کے نزدیک کسی ایک مکتب فکر کی جم کر پیروی کرنا لازم ہے، حالانکہ اگر یہ تمام فقہی مکاتب فکر اپنے تمام تر ابعاد کے ساتھ وحی الٰہی کی مستند تعبیریں ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ان کے باہمی اختلاط کو روا نہ رکھا جائے یا ان کے مشترکہ انتخاب کو فرار یا رخصت کے رویے پر محمول کیا جائے۔ واقعہ یہ ہے کہ وحی جب فقہ کی سطح پر جلوہ گر ہوتی ہے یا اسے روشنی کے طور پر برتنے کے بجائے مدوّن قانون کی شکل دی جاتی ہے تو اس میں انسانی ذہن کی نارسائی اپنی تمام تر ابعاد کے ساتھ جلوہ گر ہوجاتی ہے، پھر وہی روشنی جو کبھی انسانوں کو آگے آگے راستہ دکھاتی تھی اس کے پیروں کی بیڑیاں بن جاتی ہے۔ اہل یہود نے تلمود کی شکل میں اپنے پیروں میں بیڑیاں ڈال رکھی تھیں، فقہائے یہود کے قیل وقال سے ان کی روحانی زندگی کا چراغ جس طرح گل ہوچکا تھا صرف form ہی form باقی رہ گیا تھا، علم تھا لیکن روشنی سے خالی ﴿**مثلهم كمثل الحمار يحمل اسفارا**﴾ (الجمعہ:۵) میں دراصل اسی کیفیت کا بیان ہے۔ رسول عربی کا کام اہل یہود کو اس بوجھ سے نجات دلانا تھا جو انہوں نے خود وحی کی اپنی من مانی تشریح وتعبیر کے ذریعہ اپنے اوپر ڈال رکھی تھی اور جو مطالب وحی ہرگز نہ تھا: ﴿**ويضع عنهم اصرهم والاغلال التي كانت عليهم**﴾ (الاعراف:۱۵۷) لیکن افسوس کہ جس بوجھ سے نجات دلانے کے لئے نبی اس دنیا میں آیا تھا خود اس کی اپنی امت نے وحی کے چشمۂ صافی پر تعبیرات کا ایک ایسا حصار کھڑا کردیا جس کا توڑنا فی نفسہٖ ایک بڑا چیلنج ہے۔

اسلام میں مشناتی ادب کے ارتقاء اور وحی کے گرد انسانی فہم کا حصار کھڑا کردینے سے وہی صورت حال پیدا ہوگئی جو اس سے پہلے سابقہ امتوں کے ساتھ پیش آچکی تھی اور جس کی ایک روشن مثال اہل یہود تھے۔ تاریخی اعتبار سے یہ بات بھی پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ اس خطرے کا احساس عین ابتدائے اسلام میں کبار صحابہ کو ہوگیا تھا۔ یہی وجہ کہ شیخین کے عہد میں مسلم معاشرہ روایت کے بیان میں انتہائی احتیاط سے کام

لے رہا تھا۔ اس وقت سنت کا مفہوم سنت متواترہ تھا جسے مسلم معاشرہ وحی کی تشریح وتعبیر کا حتمی اور مستند قالب سمجھتا تھا۔ لیکن جب بعد میں خبر آحاد کی روایتوں نے اختلافات کی صورت حال پیدا کردی تو حضرت عمرؓ کو اس سلسلے میں سخت موقف اختیار کرنا پڑا۔ حتیٰ کہ جو لوگ اقوال رسولؐ کی جمع وتدوین میں غیر معمولی جوش و خروش کا اظہار کررہے تھے ان کو حضرت عمر نے اس تنبیہ کا حق دار جانا کہ لوگو! ایسا نہ ہو کہ تم لوگ دین محمدی میں ایک نئے مشناۃ کی بنیاد ڈال دو۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ صدیق نے اقوال رسول پر مشتمل کوئی پانچ سو احادیث کا ایک تحریری مجموعہ تیار کرلیا تھا لیکن ایک ایسے عمل کو جس کی خود آپ نے اجازت نہ دی تھی انجام دینے کی وہ ہمت نہ جٹا سکے۔ مؤرخین بتاتے ہیں کہ بہت کچھ غوروفکر کے بعد بالآخر آپ نے اس مسودے کو تلف کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ ان امور پر تفصیلی بحث حدیث کے باب میں آئے گی۔

وحی کو انسانی فہم اور فنی مباحث کے تابع کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ وحی جو کبھی زمین و آسمان کے رشتے سے عبارت تھی اور جس کی روشنی سے مستقبل کا راستہ روشن ہوتا تھا ایک بے جان تہذیبی ورثے میں تبدیل ہوگئی۔ متقدمین اور بالخصوص ائمہ اربعہ کے فہم کو حرف آخر سمجھ لینے کے نتیجے میں امت پر زندہ ذہنوں کے بجائے مرحوم روحوں کی حکومت ہوگئی، جو اپنے تمام تر تفکر و تدبر اور بیداری قلب ونظر کے باوجود حال اور مستقبل میں دیکھنے سے قاصر تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وحی کی تجلی منجمد اور بے جان رسومات کی نذر ہوگئی اور جب ایک بار وحی کا آفتاب اوہام وتقلید کے بادلوں میں چھپ گیا تو امت کو اپنی راہ کے گم ہوجانے کا احساس فطری تھا۔ یہ وہی معروف طریقہ کار تھا جس پر چل کر پچھلی امتیں اپنے منصب سے معزول ہوچکی تھیں اور جس کے بارے میں تفصیلی مباحث امم سابقہ کے حوالے سے بہ تکرار وتواتر وحی ربانی میں موجود ہے۔ اس تاریخی پس منظر میں کہ جو امت یہود اور امت مسلمہ کا ہے، اگر ان قرآنی تبصروں پر نگاہ ڈالی جائے تو اسباب زوال کی تفہیم کچھ زیادہ مشکل نہیں رہ جاتی۔

امت مسلمہ سے پہلے امت مامور کے منصب پر بنی اسرائیل فائز تھے جیسا کہ قرآن میں وارد ہے: ﴿**يٰبني اسرائيل اذكروا نعمتي التي انعمت عليكم واني فضلتكم على العالمين**﴾ (البقرہ: ۴۷) اللہ نے بنی اسرائیل کو خیر امت کے منصب پر فائز کیا اور اس منصب عظیم کے حوالے سے ان سے وہ میثاق لیا جس کا تذکرہ قرآن اس طرح کرتا ہے: ﴿**وإذ اخذنا ميثاقكم لاتسفكون دمائكم ولا تخرجون أنفسكم من دياركم ثم اقررتم وأنتم تشهدون. ثم أنتم هٰؤلاء تقتلون أنفسكم وتخرجون فريقاً منكم من ديارهم تظٰهرون عليهم بالإثم والعدوانؕ وان يأتوكم أُسٰرىٰ تُفٰدوهم وهو**

محرم عليكم اخراجهم، افتؤمنون ببعض الكتٰب وتكفرون ببعض فما جزاء من يفعل ذلک منكم الا خزي في الحيٰوة الدنيا ويوم القيٰمة يردون إلى اشد العذاب وما الله بغافل عما تعملون﴾ (البقرہ:۸۴-۸۵) خود اہل یہود کی مقدس کتاب تورات (کتاب خروج) میں اس منصب جلیل کے حوالے سے خدا کا یہ وعدہ موجود ہے کہ اگر بنی اسرائیل نے فی الحقیقت احکام الٰہی کا پاس کیا اور اس میثاق کی حفاظت کی تو وہ سارے انسانوں کے مقابلے میں خدا کے لئے ایک خزانۂ خاص ہوں گے۔[۳۲] یہ تھا وہ منصب عظیم اور یہ ہے امت سابقہ بنی اسرائیل کی عظیم الشان تاریخ جس پر عہد سابق میں ہونے والے فضل الٰہی کا تذکرہ بکثرت قرآن میں موجود ہے۔ یہ اعزاز کہ کسی امت کو تمام عالم پر فضیلت دی جائے، اسے اللہ تعالیٰ کار نبوت کے لئے منتخب کرے کوئی معمولی بات نہیں۔ اہل یہود کی مقدس کتابوں میں اس فضیلت کا سبب یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ نے دنیا کی تمام قوموں کو دعوت عام دی کہ کون ہے جو اس کتاب کو قبول کرے، لیکن اس بھاری ذمہ داری کو قبول کرنے کے لئے اہل یہود کے علاوہ کوئی اور قوم تیار نہ ہوئی کتاب خروج کی آیت ۲۴:۷ کی تشریح یہودی علماء اسی انداز سے کرتے ہیں۔ ہر سینا گاؤگ میں تورات مقدس کی تلاوت سے پہلے اہل یہود جو دعاء پڑھتے ہیں۔ اس میں بھی ان کی قومی عظمت کا سبب تورات کے حوالے سے بتایا جاتا ہے: اے رب ذوالجلال صرف تو ہی حمد کے لائق ہے، کائنات کا بادشاہ جس نے ہمیں تمام قوموں پر فضیلت دی اور ہمیں تورات عطا کیا۔[۳۳] اس بات کے تو اہل یہود بھی قائل ہیں کہ تورات ان کی زندگی کا انمول خزانہ ہے اور یہ کہ اس کے حوالے سے تمام عالم پر ان کی برتری قائم ہے۔ یہی وہ دستاویز ہے جو انہیں امت منتخبہ یا خیرامت کے منصب پر فائز کرتی ہے۔ البتہ تورات کی ان تمام تر فضیلتوں کے باوجود، جو اہل یہود کے عقیدے کا لازمہ ہے، امر واقعہ یہ ہے کہ ان کی پوری تاریخ تورات سے براہ راست روشنی حاصل کرنے کے عمل سے خالی ہے۔ اولاً انہوں نے اصل تورات کو ضائع کر دیا کہ خود یہودی محققین اور علماء کے مطابق موجودہ تورات معبد کے دوسرے انہدام (70AD) کے بعد کی پیداوار ہے۔ خمسہ موسوی کی آخری کتاب (Deutronomy) کے آخری حصے میں اس بات کی اندرونی شہادت موجود ہے کہ یہ صحیفے اصل تورات کو محفوظ کرنے کی کوششوں کے نتیجے میں وجود میں آئے ہیں۔ گویا الواح موسیٰ کے ذریعہ وحی کی راست تجلی جو بنی اسرائیل کے حصے میں آئی تھی وہ بڑی حد تک ضائع ہوگئی۔ ثانیاً جو کچھ زبانی طور پر یا نامکمل اور ناقص مسودات کے ذریعے پانچ کتابوں کی شکل میں محفوظ کیا گیا تھا اس پر بھی علمائے یہود نے قیل وقال کا وہ بازار گرم کیا کہ حضرت مسیح کو کہنا پڑا کہ اے ریاکار فقیہ اور فریسیو: تم مچھر چھانتے اور اونٹ نگل

جاتے ہو۔[۳۴] رہی سہی محرف وحی کے گرد انسانی تشریح وتعبیر کا حصار اتنا سخت ہوگیا کہ بسا اوقات مطالب وحی ان فقہی موشگافیوں میں دفن ہوگیا اور انسانی ذہن کی معرکہ آرائیاں اس پر غالب آگئیں۔ ایک ایسی صورت حال پیدا ہوگئی جو قرآن کے الفاظ میں ﴿**یحرفون الکلم عن مواضعه ویقولون سمعنا وعصینا واسمع غیر مسمع وراعنا لیّاً بألسنتهم وطعناً في الدین.**﴾ (النساء:۴۶) کے مصداق تھی۔

جب وحی کی روشنی ہاتھوں سے پھسلنے لگے تو کوئی وجہ نہیں کہ جو امت اسی حوالے سے منصب فضیلت پر فائز کی گئی ہو اس کی معزولی عمل میں نہ آئے۔ بنی اسرائیل کو صورت حال کی نزاکت سے بار بار خبردار کیا گیا اور انہیں اس عذاب الٰہی سے ڈرایا گیا جو کسی امت مامور کی پے درپے غلطیوں اور سرکشیوں کے نتیجے میں ان پر مسلط کیا جانا مقدر ہوتا ہے۔ کتاب عموس میں ان تنبیہات کا بڑا لرزہ انگیز بیان ملتا ہے کہ کس طرح سرکشوں پر خدا کی زمین تنگ کردی جاتی ہے۔ کہ خدا زبردست قوت والا ہے وہ تو کوہِ کارمل کی چوٹی پر چھپے باغیوں کو بھی تلاش کرلائے گا۔ اور اگر وہ سمندر کی تہہ میں جاچھپیں تو سانپ کو حکم دے گا کہ وہ اسے ڈسے۔ اور قیدی بن کے دشمنوں کے سامنے جائیں تو وہ تلوار کو حکم دے گا کہ وہ اسے قتل کردے۔ کتاب عموس کے بیان کے مطابق خدا کہتا ہے کہ ایسے لوگوں کی طرف میں نگاہ بدکروں گا اور نیک نظر نہ کروں گا۔[۳۵] وہی امت مامور جو کبھی امامت عالم کے منصب پر فائز ہوتی ہے، بدعہدی اور سرکشی کے نتیجے میں ایک ایسی صورت حال میں جاپہنچتی ہے جہاں خشکی اور تری کہیں بھی اسے پناہ نہیں ملتی اور جن پر خدا نگاہ غلط انداز بھی ڈالنا پسند نہیں کرتا۔ قرآن کے الفاظ میں ﴿**ضربت علیهم الذلة والمسکنة وباؤوا بغضب من اللّٰه**﴾ (البقرہ:۶۱) کی یہی وہ اذیت ناک صورت حال ہے جو معزول امتوں کا مقدر ہوا کرتی ہے۔ حاملین کتاب اگر کارِ نبوت سے دست کش ہوجائیں تو ذلت ولعنت ان کا مقدر بن جاتی ہے اور جس پر سے اللہ اپنا دست شفقت اٹھالے بھلا اس کی مدد کو کون آسکتا ہے: ﴿**اولئک الذین لعنهم الله ومن یلعن الله فلن تجد له نصیرا.**﴾ (النساء:۵۲)

اب تک کے مباحثت میں ہم نے صرف ان امور پر روشنی ڈالی ہے کہ کس طرح وحی کی تجلی ربانی انسانی تعبیرات کے زیرِ اثر خیر امت کو ﴿**مغضوب علیهم**﴾ میں تبدیل کرسکتی ہے۔ ہم نے کسی حد تک وضاحت سے یہ بھی بتانے کی کوشش کی ہے کہ مختلف تاریخی اور تہذیبی وجوہات کی بنا پر کس طرح اہل یہود کی طرح ہمارے یہاں بھی انسانی تعبیرات کا حصار سخت ہوتا گیا یہاں تک کہ ایک ایسی صورت حال پیدا ہوگئی کہ جمہور امت کا رویہ وحی ربانی کی طرف تاریخ و روایات اور متقدمین کی فہم کا تابع ہوکر رہ گیا۔ راست اکتساب ایک خطرناک خیال اور مذموم بدعت بن گئی، سلف کی تعبیرات حرف آخر ٹھہریں، اور زندہ

لوگوں کے لئے وحی کی شمع سے اپنے دل و دماغ کو منور کرنا ممکن نہ رہا۔ مشناۃ، مدراش، حلاقہ، یا کبالائی طریقۂ تعبیر اور ان کے اسلامی version ہماری تہذیبی اور تاریخی سرزمین میں کچھ اس طرح اگ آئے کہ ان پر اجنبی ورثے کا گمان بھی نہ ہوا۔ دیکھتے دیکھتے وحی کی تابانی ضخیم مجلّات، پیچیدہ اصول فقہ، غیر ضروری کلامی بحثوں اور رجال کی تحقیق و تفصیل میں چھپ گئی۔ تاریخ وروایات، منطق وفلسفے اجنبی خیالات و افکار نے مذہبی فکر میں کچھ اس طرح اپنی جگہ بنائی کہ متعلقات یا معاون علوم، اصل علم دین قرار پا گئے جن کو عبور کئے بغیر وحی تک پہنچنا دشوار ہو گیا اور خود چونکہ ان علوم کے منہج میں فطرتاً معاون اور معلوماتی علوم کو عبور کرنا ممکن نہ تھا اس لئے بہرصورت وحی کی تجلیوں سے اپنی راہوں کے منور کرنے کے رجحان نے دم توڑ دیا۔ ایک ایسی صورت حال میں یہ ممکن نہ تھا کہ اپنے نظری اور الہامی سرمائے سے دست کش ہونے یا بالفاظ دیگر اسے انسانی فہم میں محصور کر دینے کے باوجود امت مسلمہ خیر امت کے منصب پر ہی فائز رہتی۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس متوقع زوال یا معزولی کے عمل کو سمجھنے کے لئے ان نظری التباسات اور انحرافات کا بیان ہو جائے جو وحی کو انسانی تشریح وتعبیر کے تابع کرنے کے نتیجے میں اہل یہود کی طرح امت مسلمہ کے اندر بھی در آئی تھیں اور جس کی وجہ سے اس حصار کو توڑنا مشکل ہوتا گیا۔

جیسا کہ بتایا جا چکا ہے اہل یہود کی عظمت تورات کے حوالے سے قائم ہوئی تھی۔ تمام دنیا پر ان کی فضیلت کی وجہ اس کے علاوہ کچھ نہیں تھی کہ انہیں کارِ نبوت تفویض کیا گیا تھا۔ البتہ جب وحی کی روشنی ان کے ہاتھوں سے پھسلتی گئی اور وہ عہد شکنی کے مرتکب ہوئے تو ان کے دلوں پر قساوت نازل کر دی گئی۔ کل تک جو لوگ حاملین وحی تھی وہ اب اپنے نظری انحراف کے نتیجے میں دانستاً تحریف وحی کے مرتکب ہو گئے: ﴿**فبما نقضهم ميثاقهم لعنّٰهم وجعلنا قلوبهم قاسية يحرفون كلم عن مواضعه**﴾ (المائدہ:۱۳) وحی کی روشنی جب انہوں نے گم کر دی یا اس پر اپنی تعبیرات کے پہرے بٹھا دئے تو باہمی اختلافات کا پیدا ہونا بھی لازمی تھا۔ نصاریٰ کے حوالے سے اس باہمی عداوت کا تذکرہ قرآن میں اسی پس منظر میں بیان ہوا ہے ﴿**ومن الذين قالوا انا نصارىٰ اخذنا ميثاقهم فنسوا حظّاً مما ذكروا به فاغرينا بينهم العداوة والبغضاء الى يوم القيامة**﴾ (المائدہ:۱۴)

زوال زدہ قوموں کے لئے سب سے اذیت ناک صورت حال یہ ہوتی ہے کہ وہ اس زوال کا ادراک نہیں کر پاتیں بقول اقبال:۔

وائے ناکامی متاع کارواں جاتا رہا

کارواں کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا

احساس زیاں کا رخصت ہوجانا اذیت زوال کی انتہائی معراج ہے۔ دیکھتے دیکھتے اردگرد کے حالات بدل جاتے ہیں۔ حالات و واقعات پکار پکار کر کہتے ہیں کہ تم اب وہ نہیں رہے جو کل تک تھے۔ لیکن خیر امت کا نشہ اور فضیلت عالم کی باتیں بآسانی حقیقتِ حال کا اندازہ نہیں ہونے دیتیں۔ معزول امتیں چونکہ وحی میں اپنی تصویر دیکھنے کے بجائے وحی کی تعبیرات میں اپنی تصویر دیکھتی ہیں اس لئے انھیں اپنے مسخ شدہ نظری حلیے کا ادراک نہیں ہو پاتا۔ متقدمین کی تعبیریں یہ بتاتی ہیں کہ خیرامت بنے رہنے کے لئے مظاہر پرستی بہت کافی ہے۔ علماء عظام نے اپنی تعبیرات میں مسلمان بنے رہنے کے لئے جو شرائط پیش کی ہیں اور جس طرح بندگی بجالانے کے لئے فقہیں مدون کردی ہیں اگر اس کی اتباع کی جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ تمہارے مسلمان ہونے پر شک کیا جائے، یا کارِ نبوت کے سلسلے میں تم پر کسی عہد شکنی یا بے توجہی کا الزام آئے۔ جب دین کو مدون مظاہر کا نام مل جائے تو معزول امت کے لئے نہ صرف یہ کہ اپنے زوال کا ادراک مشکل ہوجاتا ہے بلکہ اس کی سمجھ میں یہ بات بھی نہیں آتی کہ آخر کیا وجہ ہے کہ تاریخ پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑتی جارہی ہے۔ اس کی فطری اور عملی زندگی میں بہت کچھ کھوئے جانے کا مبہم احساس تو ہے لیکن وہ اس زیاں کو آخر کیوں بیان میں لانے کی قدرت نہیں رکھتی۔ یہ موہوم احساس نہ جانے کیوں اس کی گرفت میں آتے آتے رہ جاتا ہے۔

پھر ساری توجہ اس بات پر مرکوز ہوجاتی ہے کہ عملی اور نظری دنیا کے خلیج کو تاویلات کے ذریعے کیسے پاٹا جائے۔ خیر امت ایک functional منصب ہے۔ جو امت کارِ نبوت سے دست کش ہوجائے وہ اس منصب پر باقی نہیں رہ سکتی۔ اللہ کے یہاں انعام وفضیلت کارِ نبوت سے وابستہ ہے۔ اہل یہود ہوں یا امت محمدی وہ منصب نبوت سے دست کش ہوکر اس اعزاز کے مستحق نہیں ہوسکتے۔ اس سیدھی سادی حقیقت کو قبول کرنا ان امتوں کے لئے ممکن نہیں ہوتا جو وحی کے گرد انسانی تعبیرات کا پہرہ بٹھا دیتی ہیں کہ انسانی تعبیرات ﴿**یحرفون الکلم عن مواضعه**﴾ (المائدہ:۱۳) کی راہ پر لے جاتی ہیں۔ وہ جھوٹی تاویلات کے ذریعہ معزول قوموں کو حقیقتِ حال کے ادراک سے روکتی ہیں۔ وہ یہ بتاتی ہیں کہ تم اللہ کے نزدیک خزانۂ خاص ہو، خیر امت ہو، تمام عالم پر تمہاری فضیلت مسلم ہے۔ تمہاری دنیا اگر کھوٹی ہوگئی تو کیا ہوا، آخرت تو تمہارے لئے محفوظ ہی ہے۔ تشریعی امور میں اگر تاریخ تمہارے ہاتھوں سے پھسل گئی ہے تو کیا ہوا، تکوینی امور تو اب بھی تمہارے ہاتھوں میں ہے یا کم از کم تمہاری تعبیرات سے ہم آہنگ ہے۔

صورت حال کا حقیقی ادراک کے بجائے معزول امتوں کی فکری کاوشوں کا محور یہ ہوتا ہے کہ کسی طرح ذلت ومسکنت کی اس اذیت ناک صورت حال کو ہی دنیا میں امت منتخبہ کا مقدر بتایا جائے اور خیر امت کے حوالے سے جن انعامات اور فضل کا اللہ نے وعدہ کررکھا ہے اسے دنیا سے ہٹا کر پوری طرح آخرت میں منتقل کردیا جائے۔ نظریے کی سطح پر یہ ایک بہت بڑی تبدیلی ہے جو دراصل ایک نئی دینیات کی تیاری چاہتا ہے اور جس کے لئے ضروری ہے کہ خوش فہمیوں اور خوش خیالیوں پر مشتمل خوش عقائدگی کو رواج دیا جائے۔

عقیدہ کسی امت کے لئے mission کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر کسی قوم کا عقیدہ بدل جائے یا اس کی تعبیرات میں فرق آجائے تو زندگی کی طرف اس کے رویے میں واضح تبدیلی آجاتی ہے۔ اہلِ یہود کے منصب فضیلت یا امتِ مسلمہ کے آخری خیر امت کے بیان سے یہ حقیقت منکشف ہوتی تھی کہ اب دنیا کی تاریخ ان امتوں کی امامت میں اپنا راستہ طے کرے گی۔ عالمی سیادت کے منصب پر پہلے اہل یہود اور پھر امت محمدی فائز کی گئی۔ آخرت میں تمام انعامات کے علاوہ خود دنیا میں سیادت وعظمت ان کا حصہ بتائی گئی۔ داؤدؑ اور سلیمانؑ کی بادشاہت، جس کے لوٹنے کی تمنا اب بھی اہل یہود کرتے ہیں، دراصل انبیاء کے ہاتھوں میں انسانی تاریخ کی لگام دینے کا بیان ہے: ﴿**یا داؤد انا جعلناک خلیفة في الارض فاحکم بین الناس بالحق ولا تتبع الھوی فیضلّک عن سبیل اللّٰہ. ان الذین یضلون عن سبیل اللّٰہ لھم عذاب شدید بما نسوا یوم الحساب.**﴾(ص:۲۶) منصب نبوت پر داؤد کی تنصیب کے بعد ان سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ وحی کی روشنی میں امور مملکت انجام دیں۔ بالفاظ دیگر حق وانصاف پر قائم رہیں۔ اہل یہود کی معزولی کے بعد قیامت تک کے لئے خیر امت کے منصب پر امت مسلمہ کو فائز کردیا گیا۔ دنیا کی رہنمائی کا کام اور وحی کی روشنی سے انسانی معاشرے کو منور رکھنے کا فریضہ امت وسط کے ہاتھوں میں سونپا گیا: ﴿**وکذلک جعلناکم امة وسطاً لتکونوا شھداء علی الناس ویکون الرسول علیکم شھیدا**﴾ (البقرہ:۱۴۳) دراصل اسی غیر معمولی اور بے مثل تاریخی واقعے کا بیان ہے جب پوری کی پوری امت کار نبوت پر مامور کردی گئی اور جب رہتی دنیا تک لئے سیادتِ عالم کا اعزاز اس امت کو منتقل کردیا گیا۔ امتِ وسط کے الفاظ سے اسی عدل وانصاف کی طرف اشارہ مقصود ہے جو وحی کے لئے لازمۂ رحمت کی حیثیت رکھتا ہے۔ وحی کو برتنے کے نتیجے میں عدل وانصاف کی کیفیت پیدا ہوتی ہے، حقیقت پسندی اور نقد واحتساب کا رویہ پیدا ہوتا ہے اور نقد واحتساب کا یہ رویہ وحی کو تعبیرات کے پردے میں گم ہونے سے روکے رکھتا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔

امت مسلمہ کو جب خیر امت کے منصب پر فائز کیا گیا تب اس کے حاشیہ خیال میں بھی یہ بات نہ تھی کہ اسے آخری وحی کے حاملین کی حیثیت سے صرف روحانیت یا اخلاقیات کا کوئی مجموعہ عطا کیا جارہا ہے۔ داؤد وسلیمان کی بادشاہت اور اہلِ یہود کے تمام عالم پر فضیلت کے حوالے سے انہیں جو کچھ عطا کیا جارہا تھا، اس سے یہ بات مترشح تھی کہ اب تا قیامت خلافتِ ارضی کا منصب ان کا حصہ ہے۔ مدینہ میں آپؐ کے داخلے کے بعد میثاقِ مدینہ کے ذریعے یہ بات واضح ہوچکی تھی کہ دین ودنیا کے تمام معاملات میں اب آخری رسولؐ اور اس کی امت کو final say حاصل ہے۔ وقت کی دو بڑی Super Powers قیصر وکسریٰ کی حکومتوں کے عنقریب زوال کی پیش گوئی قرآن میں کردی گئی تھی۔ گویا یہ بتانا مقصود تھا کہ اب نبیؐ عربی کے ظہور کے بعد دنیا کے سیاہ وسفید کا فیصلہ اسی نبیؐ اور اس کی امت کے ہاتھوں ہونا ہے۔ ایران وروما کی سلطنتوں کا بکھرنا طے پاچکا ہے، کہ اب خیر امت کے منصب پر نبیؐ عربی کی امت فائز کردی گئی ہے۔ خیرامت کا تصور دنیا وآخرت دونوں جہاں کے انعامات سے عبارت تھا۔ مسلمان یہ سمجھتے تھے کہ چونکہ خدا نے ان کو آخری امت کی حیثیت سے منتخب کرلیا ہے اس لئے دنیا کی کوئی قوت اب ان کے مقابلے نہیں ٹھہرسکتی۔ سیادت ان کا مذہبی فریضہ ہے۔﴿وأنتم الأعلون ان کنتم مؤمنین﴾ (آل عمران:۱۳۹) کی بشارت کو وہ عملی دنیا میں پورا ہوتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ عقیدہ کی اس قوت نے ان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو ایک معنویت اور مشن عطا کردیا تھا۔ فرض منصبی میں گہرا یقین اور دنیا اور آخرت میں غلبہ وکامرانی کے وعدۂ ربانی نے ان کی زندگیوں میں ایسا جوش وخروش بھردیا تھا کہ اس سیلاب پر دنیا کی بڑی سے بڑی قوت بھی روک لگانے کی متحمل نہ تھی۔

البتہ جب وحی کی طرف ہمارے رویے میں تبدیلی آ گئی اور اس کے نتیجے میں ہم زوال سے دوچار ہوگئے تو خیر امت سے متعلق اپنے عقائد کو بھی حالات کے تابع کرنے کی کوشش کی۔ غلبہ وکامرانی کے الٰہی وعدوں کو اس دنیا سے آخرت میں منتقل کرکے ہم نے ایسے عقائد بنا ڈالے جو ہماری موجودہ ذلت ومسکنت کے باوجود ہمیں بآسانی خیر امت باور کراسکیں۔ امورِ دنیا کو دوسروں کے لئے چھوڑ کر ہم نے اپنی فضیلت کو صرف آخرت تک محدود کردیا۔ پھر ہمارے یہاں اُن خوش عقائدگیوں نے جنم لیا جو کبھی اہلِ یہود کا طرۂ امتیاز ہوا کرتی تھیں۔ دنیا اور امورِ دنیا کو ہڈی سے تشبیہ دی گئی جسے کتے چوستے ہیں۔ ہم نے اپنے لئے بزعمِ خود آخرت کو منتخب کرلیا۔ حالانکہ آخرت کی تمام نعمتوں کی بشارت دنیا میں کارِ نبوت کی انجام دہی کے نتیجے میں دی گئی تھیں لیکن ہم نے اسے فی نفسہٖ اپنا پیدائشی حق قرار دیا۔ ترکِ دنیا کے نتیجے میں حصولِ

آخرت کے نئے نئے فارمولے ایجاد ہوئے۔ ایک ایسی رہبانیت وجود میں آ گئی جس کی اہلِ نصاریٰ کے حوالے سے قرآن نے مذمت کی تھی اور جس راستے سے اہلِ نصاریٰ وحی انجیل کو چھوڑ کر فسق میں مبتلا ہوگئے تھے : ﴿**ورهبانية ابتدعوها ماكتبناها عليهم الا ابتغاء رضوان اللّٰه فما رعوها حق رعايتها فاتينا الذين آمنوا منهم اجرهم وكثير منهم فاسقون**﴾ (الحدید: ۲۷)

خیر امت کو روحانی منصب قرار دینے اور انعامات الٰہی کے دنیا وآخرت کے وعدے کو پوری طرح آخرت میں منتقل کرنے کے نتیجے میں امت کے رویے اور اس کے world-view میں بنیادی تبدیلی آ گئی۔ امتِ مرحومہ نے اب اپنی معزولی کو ہی عین تنصیبِ منصب قرار دے دیا۔ احساسِ زیاں چونکہ جاتا رہا تھا اس لئے دوبارہ منصبِ نبوت کی واپسی کے لئے حقیقت پسندانہ رجحان پیدا نہ ہوسکا۔ اس کے برعکس یہ خیال عام ہوا کہ دنیا تو اہلِ ایمان کے ہاتھوں سے جا چکی، پھر یہ کہ فانی دنیا میں رکھا بھی کیا ہے، اہلِ ایمان کو دراصل اپنی آخرت کی فکر کرنی چاہیے جہاں ایک دائمی رحمت ان کی منتظر ہے۔ وہ تمام انعامات اور وعدے جو کارِ نبوت کی انجام دہی سے مشروط تھے انہیں کارِ نبوت سے de-link کر دیا گیا اور اس طرح خوش فہمیوں پر مشتمل عقائد کا ایک نیا دفتر امت مسلمہ کا مقدر بن گیا۔ رفتہ رفتہ یہ خوش فہمیاں اتنی عام ہوئیں کہ اسے عقائد کا سا اعتبار حاصل ہوگیا۔ یہ عقائد کچھ نئے نہ تھے بلکہ یہ وہی خوش فہمیاں تھیں جن کا شکار یہود ونصاریٰ ہو چکے تھے اور جن کی مذمت امم سابقہ کے حوالے سے قرآن مجید میں موجود تھی۔ سیادتِ عالم سے معزول امت پر جوں جوں وقت گزرتا گیا یہ خیر امت، امت الامانی میں تبدیل ہوتی گئی۔

خیر امت کا لقب جو کبھی کار نبوت سے عبارت تھا اب محض ایک group identity بن کر رہ گیا۔ امم سابقہ کی طرح جو محض یہودیت یا نصرانیت کی قومی شناخت کو اپنی نجات کا ذریعہ سمجھ بیٹھے تھے، ہمارے یہاں بھی یہ خیال عام ہوا کہ ہر مسلمان دیر یا سویر، سزا یافتہ یا انعام یافتہ، گھوم پھر کر بالآخر جنت ہی میں پہنچے گا۔ حالانکہ قرآن نے صریح لفظوں میں محض group identity کے اعتبار کو ساقط کر دیا تھا: ﴿**وقالوا كونوا هودا او نصارىٰ تهتدوا قل بل ملة ابراهيم حنيفاً**﴾ (البقرہ: ۱۳۵) کہ اسے نہ تو یہودیت مطلوب ہے، نہ ہی عیسائیت اور نہ ہی موجودہ مسلمانی۔ بلکہ اس کا مطالبہ دین حنیف کا قیام اور اس کی پیروی ہے لیکن یہود ونصاریٰ کی طرح ہم نے بھی یہ سمجھ رکھا ہے کہ مسلمان چونکہ خیر امت ہیں اس لئے رحمت ومغفرت ان کا مقدر ہے۔ حالانکہ انعامات ومغفرت کا وعدہ، نام نہاد مسلمان، نصاریٰ یا اہل یہود کے لئے نہیں بلکہ کار نبوت کے حاملین کے لئے تھا۔ لیکن جو لوگ کار نبوت کو محض ideological badge بنا

ڈالیں ان کے لئے خدا کے انعامات اور وعدوں میں اپنے لئے ایسی گنجائش پیدا کرلینا کچھ مشکل نہ تھا۔ ﴿**یحرفون الکلم عن مواضعه**﴾ (المائدۃ:۱۳) کی اس سے روشن مثال اور کیا ہوسکتی ہے۔ حالانکہ مختلف مقامات پر، مختلف اسالیب میں اس مفروضہ جانبداری کی نفی کی گئی تھی اور یہ بتایا گیا تھا کہ خدا کے انعامات کے مستحق اصحابِ عمل ہیں نہ کہ کوئی فرقہ یا مخصوص قوم: ﴿**ان الذین آمنوا والذین هادوا والصابئون والنصاری من آمن باللّٰه والیوم الآخر وعمل صالحاً فلاخوف علیهم ولا هم یحزنون**﴾. (المائدہ:۶۹)

اہل یہود جنہوں نے اپنی راہ گم کرلی تھی اور جو سیادت سے معزولی کے نتیجے میں ذلت ولعنت کے عذاب میں مبتلا تھے۔ اپنے عظیم الشان ماضی سے کچھ اس طرح چمٹے تھے کہ انہیں یہ پتہ ہی نہ چلا کہ دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے۔ وہ اپنی سابقہ حیثیت کے حوالے سے خود کو جنت کا مستحق سمجھتے تھے اور کبھی اگر انہیں اپنی غفلت کا خیال بھی آتا تو یہ سوچ کر اپنے دل کو تسلی دے لیتے تھے کہ دوزخ کی آگ اول تو ہمیں چھوئے گی نہیں اور اگر ایسا خدانخواستہ ہوا بھی تو یہ سزا محدود مدت کے لئے ہوگی: ﴿**وذلک بأنهم قالوا لن تمسنا النار الا ایاماً معدودات**﴾ (آل عمران:۲۴) حالانکہ خدا کا ان سے ایسا کوئی وعدہ نہ تھا لیکن آخرت کے سلسلے میں اس قسم کی خوش گمانیوں نے انہیں تباہی کے راستے پر ڈال رکھا تھا: ﴿**وغرهم فی دینهم ما کانوا یفترون**﴾ (آل عمران:۲۴)۔ فضائل کی کتابوں میں اہل یہود کی نجات کے حوالے سے تو اس حد تک ضمانت موجود تھی کہ حشر کے دن حضرت ابراہیم علیہ السلام کسی بھی مختون اسرائیلی کو جہنم میں جانے سے روک دیں گے۔ قومی اور گروہی شناخت کو وجہ نجات قرار دینے کے سبب اہل یہود کی نظری اور اخلاقی زندگی تباہ ہوکر رہ گئی۔ جب آخرت محفوظ ہو تو اپنی غلطیوں کی اصلاح اور خامیوں کی نشاندہی مشکل ہوجاتی ہے۔ رجوع الی اللہ کے دروازے بند ہوجاتے ہیں، وحی سے از سرنو اپنی قومی زندگی کا چراغ روشن کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ قومی زندگی کا قافلہ زوال کی شاہراہ پر بے دھڑک چل پڑتا ہے اور وہی صورت حال پیدا ہوجاتی ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے: ﴿**فباء و بغضب علی غضب وللکفرین عذاب مهین.**﴾ (البقرہ:۹۰)

یہ تو امت یہود کی خوش فہمیوں کا بیان تھا۔ اب ذرا اس آئینے میں امت مسلمہ کی تصویر دیکھئے۔ صاف محسوس ہوتا ہے گویا ان آیات میں خود ہماری تصویر کشی کی جارہی ہو۔ کار نبوت سے دست کشی کے باوجود ہمارے یہاں جمہور مسلمانوں کے درمیان یہ عقیدہ عام ہے کہ مسلم قوم کے ہر فرد کی آخری منزل جنت ہے۔ روایات اور بزرگوں کے بیان نے اس خیال کو اتنا پختہ بنا دیا ہے کہ ہم یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ

But accordym to the Qabbalar, before the complete form 7 the hearcely man (the ten Sephiroth) was produced, there were certain priwordial

ہمارے اعمال جیسے بھی ہوں، ہم خدا سے کئے ہوئے عہد پر قائم ہوں یا نہ ہوں، خیر امت کے منصبِ عظیم کا ہمیں پاس ہو یا نہ ہو، جب ایک بار زبان سے لاالہٰ الا اللہ نکل گیا تو جنت ہمارے لئے مقدر ہوگئی۔ کمزور روایتوں نے اس عقیدے کو مضبوط بنانے میں خاصا اہم رول انجام دیا ہے۔ اسی قبیل کی ایک کمزور روایت میں تو یہاں تک مذکور ہے کہ "**من قال لا الهٰ الا اللّٰه دخل الجنة......**" پوچھنے والے نے پوچھا کہ کیا اگر وہ زنا کرے اور چوری کرے جب بھی؟ کہا گیا: ہاں! کہتے ہیں کہ پوچھنے والے نے تین بار پوچھا۔ جواب ملا کہ ہاں۔ خواہ یہ بات پوچھنے والے (ابوذرؓ) کو کتنی ہی گراں کیوں نہ گذرے۔[۳۶]

مولانا اشرف علی تھانوی نے ایک حدیث کے حوالے سے تو یہاں تک لکھا ہے کہ قیامت کے دن حق تعالیٰ مومن بندہ کا حساب چھپا کر لیں گے۔ اس کی نافرمانی اور گناہوں کا جب بیان ہوگا، تو ایسا لگے گا کہ جیسے کہ وہ بس ہلاک ہوا۔ تب حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ جاؤ ہم نے دنیا میں بھی پردہ پوشی کی تھی یہاں بھی کرتے ہیں۔[۳۷] یہ ہے وہ جانبداری جو منصف اعلیٰ کے حوالے سے ہمارے عقیدے کا حصہ بن گئی ہے۔ اور جس کے بھروسے ہم محض اپنی قوی اور ملی شناخت کو وجہِ نجات قرار دئے بیٹھے ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام اگر بنی اسرائیل کی نجات کے لئے تلمودی لٹریچر میں متحرک نظر آتے ہیں تو ہمارے یہاں بھی رسول اللہؐ کو شافع محشر قرار دینے کا عقیدہ در آیا ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ جس کی ذات عدل وانصاف میں بے مثال ہے اور جو حساب کے دن دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کردے گا، قرآن کے الفاظ میں ﴿**ومن يعمل مثقال ذرة خيراً يّره ومن يعمل مثقال ذرة شراً يّره.**﴾ (الزلزلة: ۷-۸) ہم اسی منصف اعلیٰ سے یہ آس لگائے بیٹھے ہیں کہ وہ حساب کے دن دوسری قوموں کے مقابلے میں ہماری طرف جانبداری کا رویہ اختیار کرے گا۔ حالانکہ یہ حقیقت واضح کی جاچکی ہے کہ ﴿**ليس بأمانيكم ولا امانـي اهل الكتاب مـن يعمل سوٓءًا يجز بـه ولايجـد لـه من دون اللّٰه ولياً ولا نصيـراً.**﴾ (النساء:۱۲۳) لیکن ان تمام تر وضاحتوں کے باوجود اہل کتاب کی طرح امت مسلمہ نے بھی اپنے نبی کو شفیع المذنبین قرار دے رکھا ہے۔ قرآن کی وہ آیات جو امم سابقہ کے حوالے سے اس قسم کی خوش فہمیوں کی مذمت میں وارد ہوئی تھیں انہی آیات کی تشریح وتاویل سے بالکل مختلف معانی برآمد کرلئے گئے ہیں۔

وہ دن بڑا سخت ہوگا، وہ انصاف کا دن، اس دن تمام چیزیں جیسی کہ وہ ہیں اپنی اصل حالت میں نظر آئیں گی، حقیقت بے حجاب ہوجائے گی، اس دن اس کا حضور ہوگا اور لوگوں کے اپنے اعمال: ﴿**فاليوم لا تظلم نفس شيئا ولاتجزون الا ماكنتم تعملون.**﴾ (یٰسین: ۵۴)۔ وہ انصاف کا دن

جس کے بارے میں قرآن کہتا ہے کہ اس دن سے ڈرو جب کوئی شخص اپنے آپ کو پیش کر کے دوسرے کو نہیں بچا سکے گا۔ جب کوئی شفاعت قبول نہیں کی جائے گی، نہ جرمانہ دے کر جان بخشی ہوگی اور نہ ہی کسی قسم کی مدد پہنچائی جا سکے گی: ﴿**واتقوا یوماً لاتجزی نفس عن نفس شیئاً ولا یقبل منها شفاعة ولا یوخذ منها عدل ولا هم ینصرون.**﴾ (بقرہ: ۴۸) اس دن نہ کوئی حمایتی ہوگا اور نہ کوئی شفیع: ﴿**ماللظالمین من حمیم و لا شفیع**﴾ (غافر:۱۸)

قرآن میں جہاں بھی شفاعت کا تذکرہ آیا ہے وہاں اسی بات کا اعادہ کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حضور حساب کے دن جو چیز کام آئے گی وہ لوگوں کا اپنا عمل ہوگا، نہ یہ کہ ان کی بے جا خوش گمانیاں، اس کے آگے کس کی مجال کہ اس کی مرضی کے بغیر لب کشائی کر سکے: ﴿**من ذالذی یشفع عنده الا باذنه**﴾ (البقرہ:۲۵۵) اس دن جب لوگ دوبارہ اٹھائے جائیں گے خدا کے دربار کا جلال اور اس کی ہیبت کا یہ عالم ہوگا کہ قطار اندر قطار فرشتے بھی لب کشائی کی ہمت نہ جٹا سکیں گے الا یہ کہ خود ان سے کچھ پوچھا جائے یا انہیں بارگاہِ ذوالجلال سے اذن عطا ہو: ﴿**یوم یقوم الروح والملائکة صفاً لایتکلّمون الا من اذن له الرحمٰن وقال صوابا**﴾(نبأ:۳۸) وہ دن جو انصاف کے حوالے سے قائم کیا جائے گا اور جس دن منصفِ اعلیٰ خود انصاف قائم کرے گا اس دن کے بارے میں یہ سوچنا کہ وہاں کوئی سفارش کام آ سکتی ہے، یا کسی کی شفاعت سے نتائج بدل سکتے ہیں، دراصل قرآن کی بنیادی تعلیمات سے انکار کے مترادف ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ آج امت کا ایک بڑا طبقہ، کوئی کم کوئی زیادہ، اس غیر قرآنی تصور میں یقین رکھتا ہے کہ حشر کے دن رسولؐ اللہ کی مداخلت سے نتائج تبدیل ہو جائیں گے۔

قرآن کی یہ فہمائش اپنی جگہ کہ اے نبیؐ ان سے کہہ دو کہ میں تمہارے لئے کسی ہدایت یا خسارے کا اختیار نہیں رکھتا: ﴿**قل انی لا أملک لکم ضرّاً ولا رشداً**﴾ (الجن:۲۱) دوسروں کے لئے کیا خود اپنے لئے نبی اللہ کا محتاج ہے: ﴿**قل لا أملک لنفسي نفعاً ولا ضراً الا ماشاء اللّٰه ولو کنت أعلم الغیب لاستکثرت من الخیر وما مسني السوء ان أنا الا نذیر وبشیر.**﴾ (اعراف:۱۸۸) لیکن اس کے برعکس مسلم فکر وعقیدے میں رسولؐ اللہ کو شفاعت کبریٰ کے منصب پر فائز کیا گیا ہے جس کی رو سے آپؐ کے ہاتھ پر باب شفاعت کھلے گا[۳۸]۔ اس کے بعد دیگر انبیاء کرام حتیٰ کہ صالحین اور صدّیقین کے لئے بھی شفاعت میں حصہ بتایا گیا ہے۔ بلکہ بعض کمزور روایتوں میں تو ہر مسلمان کو یہ حق دیا گیا ہے کہ وہ شفاعت کے ذریعے مجرموں کو جہنم سے نجات دلائے یا کم از کم ان کا عذاب ہلکا کروادے۔ بخاری، مسلم،

ترمذی اور مسند احمد میں حضرت آدمؑ اور دوسرے انبیاء کرام کی بے بسی کا تذکرہ موجود ہے جنہیں شفاعت کا یارانہ ہوگا۔ ان روایتوں کے مطابق بالآخر رسول اللہ ﷺ، اللہ تعالیٰ کی اجازت سے شفاعت کا portfolio سنبھال لیں گے۔[۳۹] ترمذی کی ایک حکایت کے مطابق ایک بار اللہ کے ایک فرشتے نے رسول اللہ ﷺ کے سامنے دو متبادل پیش کئے یا تو شفاعت کا حق لیں یا آدھی امت کو جنت میں جانے کی ضمانت۔ اس روایت کے مطابق آپؐ نے شفاعت کا حق پسند کیا تا کہ اس سے کثیر فائدہ حاصل ہو۔[۴۰] حضرت علیؓ سے مسند فردوس میں مروی ہے کہ جب آیت: ﴿ولسوف یعطیک ربک فترضیٰ﴾ (الضحیٰ:۵) نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب تک میری امت کا ایک شخص بھی دوزخ میں رہے گا میں راضی نہیں ہوں گا۔[۴۱] ایک روایت میں زبانی مسلمانوں کو جنت کی ضمانت اس طرح دی گئی کہ اگر کوئی شخص نومولود کا نام محمد رکھے تو دونوں باپ بیٹا جنت میں جائیں گے۔[۴۲] کہا گیا کہ اس دن پکارنے والا پکارے گا کہ جس کسی کا نام محمد ہے وہ اس نام کی عزت وحرمت کے باعث جنت میں داخل ہوجائے۔[۴۳] امت محمدیہ پر خدا کی جانب داری اور اس کے فضلِ خاص کے بیان میں یہاں تک کہا گیا کہ دوسری امتوں کے لئے لوح محفوظ میں یہ لکھا ہوا ہے کہ ''من اطاعه فله الجنة ومن عصى فله النار'' لیکن امت محمدیہ کے بارے میں درج ہے کہ ''امةٌ مذنبةٌ وربٌ غفور''۔[۴۴] یہ اور اس قسم کی خوش گمانیوں کی ایک طویل فہرست ہے جس سے فضائل کی کتابیں پٹی پڑی ہیں۔ قرآن نے تو جنت کو انعام کے طور پر مومن کی منزل بتایا تھا ﴿ام حسبتم ان تدخلوا الجنة ولما یعلم الله الذین جاهدوا منکم ویعلم الصٰبرین﴾. (آل عمران:۱۴۲) لیکن وحی کی انسانی تعبیروں نے اسے ایک قومی اور ملی مسئلہ بناڈالا۔ اہل یہود کی طرح مسلمانوں نے بھی ایک جانب دار خدا اور شفیع المذنبین پیغمبر برآمد کرلیا۔ دنیا ہاتھ سے نکل گئی تو کیا ہوا ان خوش گمانیوں کے طفیل کم از کم آخرت پر اپنی اجارہ داری تو قائم ہوگئی۔

اہل یہود کا یہ کہنا کہ ﴿نحن ابناء الله واحباؤه﴾ (المائدہ: ۱۸) اور اس حوالے سے آخرت میں اپنے آپ کو خصوصی فضل کا مستحق قرار دینا دراصل اس ماضی پرستی کی طرف اشارہ ہے جو معزول اور مرحوم قوموں میں پیدا ہوجایا کرتا ہے۔ حال سے فرار کی خواہش تابناک ماضی میں پناہ لینے پر مجبور کرتی ہے اور حقائق کی سنگینی انہیں اس بات پر اکساتی ہے کہ وہ اب دنیا میں دائمی ذلت کو قبول کرتے ہوئے خیر کی تمام تر توقع دنیائے آخرت میں منتقل کردیں۔ خیر امت یا امت منتخبہ کا منصب واقعات اور حقائق کی دنیا میں اعتبار کھودیتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قومی زندگی ایک طرح کے mock-play کے عمل میں مبتلا ہوجاتی ہے۔ جاہ

وحشم اورعزت واعتبارتو رخصت ہوجاتی ہےلیکن بھاری بھرکم اصطلاحوں کا رواج برقرار رہتا ہے۔نبوت کی جگہ مشائخیت لے لیتی ہے اور وحی کی جگہ انسانی تعبیر فکری زندگی کا سرمایۂ کل قرار پاتی ہے۔ دیکھتے دیکھتے اولوا الامر کے منصب پر مختلف اور متضاد خیالات کے لوگ فائز ہوجاتے ہیں اور وہی امت جو کبھی وحی کی روشنی میں اتحاد و اتفاق کی زندگی گزارتی تھی اور جس کے حرکت وعمل سے وحدت کا اظہار ہوتا تھا،مختلف اولوا الامر کی اطاعت میں سخت انتشار اور اختلاف کا شکار ہوجاتی ہے۔قومی زندگی کا mock-play جہاں بظاہر پوری سماجی زندگی شریعت کی اتباع کے حوالے سے سجائی جاتی ہے، بہت جلد دین اور دنیا کی تقسیم کے عمل میں مبتلا ہوجاتی ہے۔سیاسی اور سماجی زندگی غلبہ واقتدار سے عبارت ہے اس لئے شریعت کے نام پر mock-play کو جاری رہنے کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ اسے صرف مذہبی، بالفاظ دیگر عائلی اور روحانی زندگی تک محدود رکھا جائے۔اہل یہود کا حلاقہ ہو یا مسلمانوں کی فقہ دونوں میں جس قسم کی تفصیلات کا بیان موجود ہے ان کا ایک بڑا حصہ عائلی یا انفرادی زندگی کی ہدایات تک محدود ہے۔ جوں جوں اقتدار سے دوری پر وقت گزرتا گیا ہے فقہائے عظام کی توجہ سماجی، سیاسی اور اجتماعی مسائل سے ہٹ کر انفرادی، عائلی اورعبادتی زندگی کی ظاہر پرستی پر مرکوز ہوتی گئی ہے۔اہل یہود کی فقہ میں اگر Kosher کی بحث پر طویل ابواب اور بے شمار طولانی مباحث قائم کئے گئے ہیں، زبان کی ترکیبوں، جانوروں کے انتخاب اور ان کے حرام و حلال کے سلسلے میں اکتادینے والی بحثیں موجود ہیں تو ہمارے یہاں بھی انہی موضوعات پر طول طویل بحثوں اورنکتہ شناسی کی ایک مستحکم روایت موجود ہے۔ زندگی کا ایک بڑا حصہ چونکہ ان حضرات کی دسترس سے باہر ہوگیا۔ اقتدار سے محرومی نے ان کی اجتماعی زندگی کو نظام وحی اور اس کی روشنی سے محروم کردیا، اس لئے جو لوگ دین کے حوالے سے دنیا جینے کی خواہش رکھتے تھے ان کے لئے دینی زندگی کو انفرادی اور عائلی زندگی تک محدود کرنا پڑا۔ دین و دنیا کی تفریق کا واضح مطلب یہ تھا کہ اجتماعی زندگی میں منصب رشد و ہدایت سے وحی کا جو جبری انخلاء ہوا تھا اس صورت حال کو مذہبی جواز فراہم کردیا جائے۔ معزول امتیں جن کے یہاں دین بمعنی فقہ یا ظاہر پرستی رائج ہوجاتا ہے ان کے لئے اس ثنویت کو قبول کرنا کچھ مشکل نہیں ہوتا۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ ایک بار جب اجتماعی زندگی میں Secularisation کا آغاز ہوگیا تو دوبارہ وہیں سے رہنمائی کا حصول مشکل ہوجاتا ہے بلکہ اجتماعی عقیدہ اس ثنویت کا قائل ہوجاتا ہے کہ دین کا مطلب مخصوص قسم کی عبادتیں اور خاص قسم کی ظاہر پرستی ہے، اور بس۔

سیکولرائزیشن معزول امتوں کے لئے ایک نئے دین کی تیاری ہے، اجتماعی اور انفرادی زندگی کی

ثنویت اس بات کا مطالبہ کرتی ہے کہ اجتماعی زندگی کے بگاڑ کو مذہبی تشریح وتعبیر نہ صرف یہ کہ گوارا کرے بلکہ اس کے لئے مذہبی جواز بھی فراہم کرے، احبارو رہبان کی فقہ اسی دور میں پیدا ہوتی ہے۔ وحی سے راست اکتساب کا چونکہ رواج باقی نہیں رہتا اس لئے یہ کافی سمجھا جاتا ہے کہ فلاں مشائخ یا فلاں ائمہ کرام کے نزدیک اجتماعی زندگی اپنے تمام تر انحراف کے باوجود قابل قبول ہے: ﴿**وان منهم لفريقاً يلؤن ألسنتهم بالكتاب لتحسبوه من الكتاب وما هو من الكتاب**﴾. (آل عمران:۷۸) tongue twisting کا کھیل نہیں بلکہ کتاب سے باطل نظریات پر دلیل لانے کی طرف اشارہ ہے۔ اولوا الامر کا منصب جب مشائخیت کے زیر تصرف آجاتا ہے تو نہ صرف یہ کہ مطالب وحی کا الٹ پھیر رواج پاتا ہے بلکہ بھانت بھانت کے یہ روحانی اولوا الامر اللہ کی آیات کو اور اس کے عہد کو تھوڑی قیمتوں میں بیچ ڈالتے ہیں: ﴿**ان الذين يشترون بعهد اللّٰه وأيمانهم ثمناً قليلاً أولٰئک لاخلاق لهم في الآخرة ولا يكلمهم اللّٰه ولا ينظر اليهم يوم القيامة ولا يزكيهم ولهم عذاب اليم**﴾ (آل عمران:۷۷) ان مذہبی قائدین کے اندر قساوت کا یہ عالم ہوتا ہے کہ وہ دھڑلے سے مطالب دین کے خلاف فتاوے جاری کرتے اور اسے مصالح امت اور مطالب دین باور کرانے سے نہیں چوکتے۔ یہی وہ عمل ہے جسے قرآن ﴿**فويل للّذين يكتبون الكتاب بأيديهم ثم يقولون هٰذا من عند اللّٰه يشتروا به ثمناً قليلاً فويل لهم مما كتبت أيديهم وويل لهم مما يكسبون**﴾ (البقرہ:۷۹) سے تعبیر کرتا ہے۔ منصب نبوت کی حامل امت اپنے تمام تر دعویٰ دینداری کے باوجود جبت اور طاغوت کی اطاعت قبول کرلیتی ہے۔ یہ سانحہ کسی عام انسانی گروہ کے ساتھ نہیں بلکہ ان لوگوں کے ساتھ پیش آتا ہے جن کے بارے میں قرآن کہتا ہے ﴿**ألم تر الى الّذين أوتوا نصيباً من الكتاب يومنون بالجبت والطاغوت ويقولون للذين كفروا هٰؤلاء اهدىٰ من الذين آمنوا سبيلاً.**﴾ (النساء:۵۱)

سیادت عالم کے منصب سے جبت و طاغوت کی بندگی کا یہ عمل امم سابقہ کے ساتھ جس طرح پیش آیا تھا واقعات کی دنیا میں آج اسی صورت حال سے امت مسلمہ دوچار ہے۔ اجتماعی زندگی کی تباہی اور سیادت عالم سے معزولی کے بعد دین کے نام پر جس مظاہر پرستی کو ہمارے یہاں اعتبار اور سند کی حیثیت حاصل ہے اس کا تعلق آسمانی وحی سے کہیں زیادہ انسانی تعبیرات سے ہے۔ دین سے دور ایک مخالف دین تصور نے ہمارے یہاں دینی فکر میں اپنی جگہ بنا ڈالی ہے۔ گویا ایک یہودیت ہے جو دین اسلام میں داخل ہوچکی ہے۔ قوانین وفرامین کا بے روح ڈھانچہ سب کچھ قرار پایا ہے، روح رخصت ہوچکی ہے۔ عوامی سطح

پر دین کا جو تصور عام ہے اسے وحی سے خدا واسطے کا بیر ہے۔ احبار و رہبان کے تفقہ پر سوالیہ نشان لگانا ایک امر محال ہے جس کی کم از کم موجودہ مسلم فکر میں کوئی گنجائش نہیں دکھتی۔ گزشتہ چند صدیوں میں اجتہاد کے حوالے سے مسلم دنیا میں جو تحریکیں اٹھی ہیں وہ اگر انتہائی کوششوں کے باوجود کوئی راستہ بنانے میں ناکام رہی ہیں تو اس کی وجہ یہی ہے کہ ابتدائی صدیوں کے canonization کو چیلنج کرنے کا ان کے اندر بھی یارا نہ تھا۔ اجتہاد ان معنوں میں کہ اپنے فکر کا چراغ براہ راست وحی ربانی سے روشن کیا جائے، اسی وقت کامیاب ہوسکتا تھا جب ہم اپنے تہذیبی اور فکری سرمائے پر تحقیقی اور تنقیدی نگاہ ڈالنے کی جرأت رکھتے ہوں ورنہ ائمہ اربعہ کے تفقہ کو اگر معتبر فہم کا واحد حوالہ قرار دیا گیا تو وحی کے گرد مشناتی حصار سے بچنا مشکل ہوجائے گا اور ہمارے تہذیبی اور فکری سرمائے میں جو یہودیت داخل ہوگئی ہے اس کے انخلاء پر ہم قادر نہ ہوسکیں گے۔ وحی کی طرف اہل یہود کی واپسی میں ایک مشکل یہ تھی کہ مشناۃ کے حصار میں وحی کے نام پر جو کچھ موجود تھا خود اس کی حیثیت بھی خالص وحی کی نہ تھی۔ البتہ ہمارے یہاں تہذیبی سرمائے کے حصار میں گھرا اور تاریخ و روایت کی گرد میں دبا وحی کا آفتاب اسی طرح موجود ہے۔ دوسری قوموں کے برعکس ہمارا مسئلہ یہ نہیں کہ ہمارے ہاں وحی کی روشنی گم ہوگئی ہے بلکہ یہ ہے کہ کیا ہم وحی کا چیلنج قبول کرنے کا یارا رکھتے ہیں؟

تعلیقات وحواشی

۱ بعض یہودی اہل فکر زبانی اور تحریری تورات کو وسیع معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک خمسہ موسوی کے علاوہ پرانے عہدنامے میں Nebiim (انبیاء) اور Ketubim (تحریریں) پر مشتمل ابواب کو بھی تحریری تورات میں شامل سمجھنا چاہئے۔ جبکہ زبانی تورات مکمل یہودی فکر وفلسفہ پر محیط بتائی جاتی ہے۔ مشناۃ (Mishnah) اور گمارا (Gemarah) کے علاوہ مدراشم (Midrashim) یعنی ربائی تاویلات اور Haggadah یعنی روایتی حکایات کو بھی اس سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے علاوہ تورات کے باطنی معانی کی تلاش میں تفسیری ادب کا جو ذخیرہ کبالا کی شکل میں پایا جاتا ہے اسے بھی زبانی تورات کا جز سمجھا جاتا ہے۔ تورات کے معانی ومضمرات کو اس قدر وسعت دینے کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اب ہر خیال کو تعبیرات کا لبادہ پہنا کر بآسانی یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ تورات میں یوں ہے جس سے مراد عام طور پر Torahic world view ہوتا ہے نہ کہ تورات بذات خود۔

۲ ''اے سعادت مند! ہم پر اور تم پر..... عقائد کو کتاب وسنت کے مطابق اس طور پر کہ علمائے اہل حق نے کتاب وسنت سے سمجھا اور اخذ کیا ہے..... کہ ہمارا تمہارا سمجھنا اگر ان حضرات کی رائے کے مطابق نہ ہو تو قابل اعتبار نہیں۔'' (مکمل حوالہ نقل کرنا ہے)

منظور نعمانی، ص ۱۵۹، مجدد الف ثانی)

''میرا تعلق اسلاف کے ساتھ ہے اور اسلاف سے خود کو کاٹ دینا ہلاکت کے مترادف ہے۔ یہ میری پختہ رائے ہے اور میں اس پر جازم ہوں کہ کسی مسئلہ پر اسلاف کی متفقہ رائے سے اختلاف خواہ وہ کسی ایک مسئلہ میں ہی کیوں نہ ہو، انتہائی خطرناک ہے۔ اسی طرح فتنوں کا آغاز ہوتا ہے۔'' (ماہنامہ میثاق لاہور، ستمبر ۱۹۸۴ء)

۳؎ صوفیاء کے ملفوظات میں سند کے بغیر براہِ راست رسول اللہ ﷺ سے احادیث روایت کرنے کا رجحان عام ہے۔ ہوسکتا ہے کہ انھوں نے ہر اچھی بات کو حدیث رسول قرار دینے کے کلیہ پر عمل کیا ہو۔ البتہ اس طریقۂ کار نے بسا اوقات اسلام کی بالکل ہی مختلف تصویر ہمارے سامنے پیش کی۔ بعض اوقات ان حضرات کی جرأت پر حیرت ہوتی ہے کہ کس طرح انھوں نے محض اپنے وہم وگمان سے ان باتوں کو بیان کرنے کی کوشش کی جس کا اللہ کے علاوہ کسی کو علم نہیں۔ معین الدین اجمیری نے اپنے پیر عثمان ہارونی کے حوالے سے ایک حدیث نقل کی ہے جو اس جسارت کی ایک عمدہ مثال ہے:

''رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا کہ آپ ہمیں اہل جنت کے خورد و پوش سے خبر دیجئے۔ حضرت نے ارشاد فرمایا کہ قسم ہے مجھ کو اس ذوالجلال والاکرام کی جس نے مجھے پیغمبری دی ہے کہ مرد بہشت میں سو مرتبہ کھانا کھائے گا اور سو ہی مرتبہ اپنی عیال داری سے محبت کرے گا۔ کسی نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! جب اس قدر کھانا پینا ہوگا تو انھیں قضائے حاجت بھی ہوگی یا نہیں؟ آپ نے فرمایا کہ نہیں، وقت قضائے حاجت شکم سے ایک ریح خارج ہوگی جس کی خوشبو مشک کو ماند کرتی جائے گی۔'' (انیس الارواح، ملفوظات عثمان ہارونی، مرتبہ معین الدین اجمیری) محولہ سلیم کے خطوط، پرویز، ج ۳، ص ۵۴

۴؎ مشناۃ، کتاب حقیقت، محولہ سلیم ج ۳، ص ۲۸

۵؎ محولہ سلیم، ج ۳، ص ۴۲

۶؎ محولہ سلیم، ج ۳، ص ۳۹

۷؎ ہمارے خیال میں مسلمانوں میں قرآنی نقوش تعویذ اور عملیات کا پورا دبستان یہودیت کے زیر اثر پروان چڑھا ہے۔ یہودیوں میں یہ تصور عام تھا کہ عبرانی زبان کے ابجد کو اگر ایک خاص طریقے سے ترتیب دیا جائے تو تورات کے باطنی معانی نکل آتے ہیں۔ ہندسوں میں باطنی تاثیر ہے بشرطیکہ اس کے ترتیب کا ہنر معلوم ہو۔ Sephiroth (Numerical emanation) دراصل خدا کے مختلف وصف کا بیان ہے۔ چونکہ خدا نہ نر ہے نہ مادہ اس لئے اس میں دونوں ہی شکلیں پوشیدہ ہیں۔ خدا ایک رأس الاعداد ہے جس میں تمام دوسرے نمبرات پوشیدہ ہیں ایک سے دس تک کے تمام نمبرات بہشتی انسان آدم کی تخلیق میں موجود ہیں۔ قبالا کے مطابق بہشتی انسان آدم کی تخلیق سے پہلے جو دنیا معرض وجود میں آئی تھی وہ اس لئے باقی نہیں رہ سکی کہ اس میں عددی توازن کا فقدان تھا۔

تورات کے صوفی شارحین کے مطابق تورات خدائے ذوالجلال کا ایک نسوانی پیکر ہے جسے معانی کی چار سطحوں پر سمجھا جانا چاہئے۔ وہ چار سطحیں اس طرح ہیں: لفظی یعنی (peshat) رمزی (remez) تمثیلی

(derash) اور سرّی (sod) ۔ کتاب پیدائش میں تخلیق کائنات سے متعلق بیانات کو متصوفین نے کچھ اس انداز سے سمجھا گویا خدا نے کائنات کی تخلیق الفاظ کے سہارے کی ہو۔ اس خیال کے مطابق تخلیق کا سارا کاروبار تین الفاظ کے سہارے ترتیب دیا گیا ہے۔ (الف/ ہوا، میم/ پانی اور شین/ آگ) انسان کی سانس میں اور کائنات کی رگ و پے میں ان ہی تین حرفوں کا کمال جاری ہے۔ اس خیال کے مطابق ان تین بنیادی حرفوں پر توجہ اور مراقبہ انسان کو کائنات اور اس کے خالق کے ساتھ ایک روحانی رشتے میں منسلک کرسکتا ہے۔ ان تین حرفوں کو محض ترسیل معانی کا ذریعہ سمجھنے کے بجائے اسے ذاتِ باری سے رشتۂ وحدت میں پیوست ہونے کا آلہ سمجھنا چاہئے۔ عبرانی حرفوں کے مختلف متعینہ اعداد اور اس کی سرّی قوتوں پر یقین نے اہلِ یہود کو اس غلط فہمی میں مبتلا کردیا کہ ان حرفوں کی سرّی قوتوں کے سہارے نہ صرف یہ کہ وہ قربِ الٰہی کے حقدار ہوسکتے ہیں بلکہ ان کی ترتیبی قوتوں کا راز حاصل کرلینے کے بعد سالک فی نفسہ تجربۂ ربانی سے ہمکنار ہوسکتا ہے۔

اپنے پیش رو ربائی اکیوا کی طرح، ابرہیم ابوالعافیہ اس روحانی تجربے کے بارے میں اس طرح گویا ہیں:

''حرفوں پر سخت توجہ اور مراقبہ کے بعد تمہیں ایسا محسوس ہوگا تمہارے سر کے بال اپنی جڑوں پر سیدھے کھڑے ہوگئے ہیں..... تمہارے خون میں ارتعاش ہوگیا ہے..... اور تمہارا تمام جسم لرز رہا ہے، تمہارے اعضاء مضمحل ہورہے ہیں اور ..... تمہیں ایسا محسوس ہوگا گویا کوئی اضافی روح تمہارے اندرون میں وجود میں آگئی ہو..... جو تمہیں اندر سے مضبوط کرتی اور تمہارے وجود میں سرایت کرتی جاتی ہو..... گویا کوئی خوشبودار روغن ہو جس کی سوگندھ سر سے پیر تک چھا گئی ہو۔''

(Abraham Abulfia, Sefer ha-Tzeruf, tr. Aryeh Kaplan, Bibliotheque Nationale ms. No. 774 and Jewish Theological Seminary ms. No. 1887, Quoted in Perle Besserman, *The Shambhala Guide to Kabbalah and Jewish Mysticism,* Massachusetts 1997, p.37)

بعض یہودی متصوفین کی تصنیفات مثلاً Sefer Yetzirah میں تین بنیادی حروف الف، میم اور شین کی ترتیب کو الٹ دیا گیا ہے۔ سالک کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ ان حرفوں کا الٹی ترتیب میں وظیفہ کرے اور ساتھ ہی ان حرفوں کی ادائیگی کے وقت انہیں اپنے تصور میں ان کی اضافی صفات کے ساتھ متصور کرتا رہے۔ مثلاً شین/ آگ کو اتھل پتھل کے ساتھ، میم/ پانی کو امن طمانیت کے ساتھ اور الف کو وجود عدم (Nothingness) کی خاموشی کے ساتھ۔

قبالائی نقطۂ نظر کے مطابق کائنات کی تخلیق باری تعالیٰ کے دس احکام ظہور کے نتیجے میں ہوئی جیسا کہ تورات میں "Aud God said....." دس مرتبہ مذکور ہے اور چونکہ یہ احکام حرفوں کے شکل میں ظاہر ہوئے اس لئے متصوفین حرفوں کی سرّی قوتِ تخلیق کے قائل ہیں اور وہ سمجھتے ہیں کہ ان حرفوں کی ترتیب کا فن انھیں خدا سے جوڑ سکتا ہے بلکہ بعضوں کے نزدیک تو یہ عمل انہیں کارِ تخلیق میں بھی شریک کرسکتا ہے۔

ملاحظہ ہو: Kaplan, Aryed. *Jewish Meditation,* New York, 1985, pp.74–75

تورات کی تفہیم کے لئے قبالائی طریقۂ تفہیم حروف کے اعداد کو خصوصی اہمیت دیتا ہے۔ اس کے مطابق تورات کی یہ سریت یا یہ خصوصی علم صرف خواص کے لئے ہے۔ اس فن میں جو تین معروف طریقے ہیں وہ یہ ہیں: Gematria جس میں حروف کی Numrical value اعدادی قیمت متعین کی جاتی ہے۔ دوسرا Notarikon جس میں لفظ کے پہلے اور آخری حرف کو اہم سمجھا جاتا ہے اور تیسرا Temurah جو دراصل حروف کے مخصوص ہندساتی ترتیب میں معانی کی دریافت سے متعلق ہے۔ مسلم مآخذ میں بھی علم الاعداد کا یہ اختلاف کچھ اس انداز سے پایا جاتا ہے۔ بعض لوگ جفر کو امام جعفر صادقؒ سے منسوب سمجھتے ہیں حالانکہ اس گوسفندی سے ان بزرگوں کا دامن پاک تھا۔ مسلمانوں میں علم الاعداد کا تاریخی ارتقاء اور اہل یہود کے سرمائے کا تقابلی مطالعہ اس امر کو واشگاف کرنے کے ئے کافی ہے کہ ان تمام خرافات اور اوہام کی بنیادیں دراصل یہود کے انحراف فکری میں ہے۔ حتیٰ کہ متاخرین علماء مثلاً شاہ ولی اللہ اور اشرف علی تھانوی کے ہاں یوگا انداز کی روحانی ورزشیں یا قرآنی آیات کو ایک دوسرے سے ملا کر پڑھنے کی سفارش پر حیرت انگیز طور پر ربائی ادب کا اثر دیکھنے کو ملتا ہے۔ جو دراصل پرانے متصوفین کے ذریعہ ان تک پہونچتی ہیں۔

ذکر کا جو طریقہ شاہ ولی اللہ کے حوالے سے ہم نے تصوف کے باب میں درج کیا ہے اسے اپنے دماغ میں مستحضر کیجئے اور ذکر جلی اور خفی کے ان طریقوں کا ایک تقابلی مطالعہ تیرہویں صدی اسپین کے معروف یہودی متصوف ابراہیم ابوالعافیہ کے طریقۂ مراقبہ سے کیجئے تو یہ سمجھنے میں دشواری پیش نہیں آئے گی کہ صوفیانہ عبادتوں کی ترتیب وتعمیر میں اجنبی مآخذ کا کتنا وافر حصہ ہے بقول ابوالعافیہ تورات کے حروف کی حیثیت ایک ایسے سیاہ شعلہ کی ہے جو سفید پسِ منظر میں کاغذ کے صفحات پر ثبت کردیا گیا ہو۔ پوری تورات بہتّر مقدس حروف کی خاص ترتیب میں سماجاتی ہے جس کا ارتکاز Yod- Heh- Vav- Heh کے چار حرفوں میں ہے۔ ابوالعافیہ کہتے ہیں کہ ان چار مقدس حروف کو دورانِ مراقبہ اس طرح عمل میں لانا چاہئے:

''ہر حرف کا نام لیں اور اسے لمبی سانس میں ادا کریں دو حرفوں کے درمیان سانس نہ لیں بلکہ جتنی لمبی سانس ہوسکتی ہو لیں اور اس کے بعد کی سانس میں توقف یا آرام کریں۔ ہر حرف کے ساتھ

اسی طرح کریں۔ گویا ہر حرف کے دوسانس لی جائے ایک اس طرح کہ اسے بولتے ہوئے استعمال میں لائی جائے جس کے ذریعے حرف کی ادائیگی ہو اور دوسری وقفہ میں آرام کے لے ہر حرف کے درمیان..... اس طرح کہ ہر سانس اندر کی طرف ہوا کھینچنے اور باہر کی طرف اس کے اخراج پر مشتمل ہو۔ الفاظ کی ادائیگی میں سانس اندر یا باہر کرنے میں لبوں کا استعمال نہ کیا جائے بلکہ ان کی ادائیگی میں کچھ ایسی ترکیب کی جائے کہ سانس کے اخراج سے ہو ہم آہنگ ہو جائیں''

(Quoted in Perle Epstein, Kabbalah: The way of Jewish mystic, P.96)

ابوالعافیہ اور دیگر متصوفین کے یہاں مراقبے کا یہ طریقہ دراصل اس مفروضے پر قائم کئے گئے ہیں کہ انسانی جسم کے اندر قوتوں کے مختلف مراکز پوشیدہ ہیں جسے عبرانی زبان کے چار مقدس حروف کے ذریعے حرکت دی جاسکتی ہے۔ شاہ ولی اللہ یا دیگر متصوفین کے یہاں سالک کو یہ مشورہ کہ وہ روحانی مراقبے میں متصور کرے گویا فضا میں سفید بادل چھاگئے ہوں اور آسمان سے نور کی بارش ہورہی ہو جس میں اس کا وجود بھیگتا جا رہا ہو۔ علماء و محققین کے نزدیک زیادہ سے زیادہ ایک نفسیاتی طریقۂ تربیت شمار کیا جاتا تھا۔ البتہ بیسویں صدی میں یہودی دنیا میں سیکولر مفکرین کے ظہور میں آنے بالخصوص Gershom Schlem, Walter Benjamin, Fraz Kafka, Marka, Martin Buber, Moshe Idel, Isaac Bashevis Singer وغیرہ کی تحریروں نے جب سے قبالائی ادب سے سّریت کی نقاب کھینچ پھینکی ہے ہمارے لئے یہ معلوم کرنا کچھ مشکل نہیں رہا کہ مشاہدۂ حق کی غیر قرآنی ترکیبیں اسلامی مآخذ سے دور اہل یہود کی صوفیانہ ثقافت سے مستعار ہیں بقول یہودی متصوف اسحٰق جو اکّو کی علاقائی نسبت سے معروف ہیں سالک اگر ہوا، پہاڑ اور آگ جیسے بنیادی عناصر کو اس خیال سے متصور کرے کہ اسے موسیٰ علیہ السلام کا تجربۂ مشاہدۂ حق مطلوب ہو تو وہ مراقبے کی ایک ایسی منتہا پر پہنچ سکتا ہے جب اس کی آنکھ آسمان اور زمین کو اس طرح دیکھے کہ ان دونوں کا مشترکہ تصور اسے محض ایک خلا معلوم ہو۔ اب سے چاہئے کہ وہ اس خلا میں ایک دائرہ متصور کرے اور اس دائرہ میں تورات کے مخففات ثبت کرتا جائے اور اسے یہ سب کچھ ایسا محسوس ہو گویا سفید کاغذ پر یہ حرف حقیقت کی طرح روشن ہو گئے ہوں۔ سالک کو ایسا محسوس ہوگا کہ رفتہ رفتہ روشن اور جگمگ الفاظ پر ایک ایسی دھند چھا گئی ہے جس میں کسی چیز کو ایک دوسرے سے امتیاز کرنا ممکن نہ ہو۔ یہی ہے Nothingness کا وہ مرحلہ جہاں ماوراء خدا کچھ بھی نہیں۔ عباسی بغداد اور مسلم اسپین میں علمائے یہود اور ان کے متصوفین کا جو قریبی تعامل مسلم ثقافت سے ہوتا رہا ہے اس کے پیش نظر زہاری تصوف کے اثرات ہماری منحرف فکر پر پڑنا کچھ عجب نہیں۔

The Meaning of the محولہ (Secret of permutation & combination of letters) Kabbalah, p. 18

۸ ہمارے نزدیک لوح محفوظ سے مراد دفتین کا ہونا اس لئے بھی قابل فہم ہے کہ نزول قرآن کے وقت اہل کتاب کے پاس الہامی تعلیمات مخصوص کتابی شکل میں محفوظ نہ تھیں۔ کوئی ایسی کتاب نہ تھی جسے کامل اور خالص وحی کے طور پر پیش کیا جاسکے۔ عیسائیوں کی انجیل، اقوال عیسیٰ اور ان کی تعلیمات پر مشتمل تھیں جو ان کے حواریوں یا بعد کے شاگردوں نے جمع کیا تھا اور جسے عہدنامہ قدیم پر اضافے کی حیثیت حاصل تھی۔ رہا عہدنامہ قدیم تو یہاں بھی تورات کوئی مخصوص کتاب نہ تھی بلکہ اسے خمسہ موسوی (مقدس ترین حصے) اور تلمودی اور تشریحی ادب میں مظہر بتایا جاتا تھا۔ تورات جس کے لفظی معنی قانون کے ہیں ایک ایسی ڈھیلی ڈھالی کتاب تھی جس سے قوانین کے اخذ و اکتساب میں بڑے لبرل ازم کا اظہار کیا جاتا تھا۔ انبیائے یہود کے علاوہ یہودی ربائیوں اور مشائخ کی آراء بھی قوانین الٰہی کا اظہار بن گئی تھیں۔ بعض اسرائیلی نبی بھی قوانین الٰہی کے بجائے قوانین ربائی کا احترام کے ساتھ تذکرہ کیا کرتے تھے۔ (دیکھئے: Malachi 2:7 اور Ezekiel 7:26) گو کہ Jermiah 8:8 اور Isaih 29:13 میں ربائی قوانین کے سلسلے میں دبی بغاوت کا اظہار بھی ملتا ہے لیکن جب بنی اسرائیل کے انبیاء لوگوں کو قوانین الٰہی کے اتباع کی دعوت دیتے ہیں تو ان کی نظر میں اس حوالے سے کسی مخصوص کتاب یا مرتب شدہ صحیفہ نہیں ہوتا۔ انبیائے یہود کی آخری کتاب Malachi اس اپیل پر ختم ہوتی ہے کہ لوگو! شریعت موسوی یا قوانین موسوی کا پاس رکھو۔ البتہ یہ شریعت موسوی کہاں پائی جاتی ہے، اس بارے میں کسی مخصوص صحیفے کی طرف یہاں بھی اشارہ نہیں ملتا۔ رہی Pentateuch کی بات تو خود یہودی محققین اس بات کے قائل ہیں اور خود خمسہ موسوی کی اندرونی شہادت سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ یہ تمام کی تمام پانچوں کتابیں صرف تعلیمات موسوی یا وحی موسوی پر مشتمل نہیں ہیں۔ لہٰذا شریعت موسوی کے طالب کے لئے صدیوں پر مشتمل مقدس یہودی لٹریچر بشمول بائبل اور اس کے متعلقات کی چھان بین لازم ہوجاتی ہے اور اس کے بعد بھی وثوق سے یہ پتہ نہیں چل سکتا، پیغمبروں اور ربائیوں کی ان تشریح و تاویل میں حق ہے کہاں اور خدا کو واقعی کیا مطلوب ہے؟ اس کے برعکس قرآن کو اس بارے میں فوقیت حاصل ہے کہ یہاں خالص اور کامل وحی دفتین میں موجود ہے۔ یہی وہ لوح محفوظ ہے جو زبانی طریقۂ روایات کے مقابلے میں قرآن مجید کو دوسرے تمام معلوم صحف سماوی سے ممیّز کرتا ہے اور یہی وہ وحی ہے جو علّم بالقلم یعنی قرطاس و قلم کے حوالے سے عطا کی گئی ہے۔

۹ تلمود ایوری مینس لائبریری سیریز، مرتب ڈاکٹر کوہین، ص ۴۰۴

۱۰؎ محولہ فکر اسلامی کی تشکیل جدید، فاروقی، ص ۳۹-۱۳۸

عقد الجید میں مجتہد کے شرائط یوں بیان ہوئے ہیں: **وشرطه انه لا بدله ان يعرف من الكتاب والسنة وما يتعلق بالاحكام ومواقع الاجماع وشرائط القياس وكيفية النظر وعلم العربية والناسخ والمنسوخ وحال الرواة.** (عقد الجید شاہ ولی اللہ اردو ترجمہ، مطبوعہ مجتبائی دہلی، ۱۳۴۴، ص ۷)

۱۱؎ کتاب فضائل القرآن، فتح الباری ج ۸، ص ۶۷۲، حدیث نمبر ۵۰۱۰

۱۲؎ ابوالحسن علی ندوی، تفسیر سورہ الکہف۔ نیز دیکھئے صحیح مسلم حدیث نمبر ۶۶۱۷، انگریزی ترجمہ ص ۳۸۶، مطبوعہ دارالعربیہ بیروت۔

۱۳؎ تفصیل کے لئے دیکھئے: ترجمہ قرآن مجید، مقدمہ از مولانا اشرف علی تھانوی، ص ۱۳-۱۵

۱۴؎ وحی ربانی تک راست رسائی کے خلاف مروّجہ عقائد نے کتنا سخت رویہ اختیار کیا ہوا ہے اس کا کسی حد تک اندازہ اس فتویٰ سے ہوتا ہے جو اہل سنت والجماعت کے ایک مؤقر دارالافتاء سے صادر ہوا ہے:

''یہ طے شدہ بات ہے کہ تحقیق وتفتیش کا کام پہلی صدی، دوسری صدی اور تیسری صدی میں پایۂ تکمیل تک پہنچ چکا ہے، اسی کا نام فقہ اسلامی ہے جو ائمہ کی تحقیقات کا مجموعہ ہے۔ لہٰذا اگر تحقیقاتِ اسلامی سے اپنے موضوعات مراد ہوں جو مکمل اور تصحیح شدہ موجود ہیں تو موجودہ دور کی تحقیق اگر اس کے مطابق ہے تو بلاضرورت ہے۔ اور اگر تحقیق اس کے خلاف ہے تو مردود ہے۔ اس پر امت محمدیہ کا اجماع ہے۔''

فتویٰ مفتی جمیل احمد تھانوی، جامعہ اشرفیہ لاہور، محولہ ایشیاء، ۱۴/اگست ۱۹۷۸ء۔

۱۵؎ Rabbi Yehiel ben Joseph, Quoted by Hyam Maccoby in Judaism on Trial

۱۶؎ "Moses received Torah from Sinai and delivered it to Joshua, and Joshua to the Elders, and the Elders to the Prophets; and the Prophets delivered it to the men of the Great Synagogue. These said three things; Be deliberate in judging, and raise up many disciples, and make a hedge around the Torah." — The Tractate 'Fathers' in the Mishuah.

And Also see: 'Chapters of the Fathers' (Pirke 'Abot) tr. Herbert Danby, in the Fathers according to Rabbi Nathen. tr from the Hebrew by Judah Goldin, Yale Univ. Press, 1955, p. 231.

۱۷ غزالی، المستصفٰی، محولہ اجتہاد اور مسائل اجتہاد۔

۱۸ جیسا کہ توراۃ میں مذکور ہے:

And all the people perceived the Thundrings and the Lightnings and the Voice of the horn and the mountain smoking (Exodus Zo:18)

۱۹ تحریری تورات کے بالمقابل زبانی لٹریچر کی اہمیت مسلّم کرنے کے لئے یہاں تک کہہ دیا گیا کہ مذہب یہود کی تمام تر تعلیمات اور اس کی تشریحات کے مآخذ طُور پر ہونے والی 'روشنی' اور 'صدا' میں واقع ہیں:

"Even what an outstanding disciple was destined to teach in the presence of his master had already been said to Moses on Sinai." (P. Peah 17a)

طور کی وحی پر انسانی تعبیرات نے اتنا سخت پہرہ بٹھادیا کہ فی نفسہٖ وحی خمسہ موسوی کی اہمیت باقی نہ رہ گئی الا یہ کہ اسے وسعت دے کر بعد کے علماء و مشائخ کی فہم سے مطابقت دے دی جائے۔

When the Holy One, Blessed be He, revealed himself on Sinai in order to give the Torah the Israel, he delivered it to Moses in this order: the scriptures (the written Torah); the Mishnah, the Talmud, the Haggadah (which, taken together designate the Oral Torah). (Exodus Rabba 47, I)

۲۰ حدیث کے الفاظ اس طرح ہیں "**عن اسامة بن شريک قال خرجت مع رسول‌الله ﷺ حاجا فکان‌الناس یاتونه فمن قائل یارسول الله! سعیت قبل أن اطوف أو أخرت شیئا أو قدمت شیئا فکان یقول لا حرج الا علی رجل افترض عرض مسلم وهو ظالم فذلک الذی حرج وهلک**"۔ (مشکوٰۃ کتاب المناسک، ج۲، مطبوعہ دمشق ۱۹۶۱، باب ۹، فصل ۳، حدیث نمبر ۲۶۵۸، ص ۴۶)

۲۱ محولہ تلمود، ص ۱۴۸

۲۲ روایت ہے کہ موسیٰ نے اپنے رب سے کہا: اے رب کائنات مجھے ہر مسئلے کے بارے میں حتمی احکام و فرامین سے آگاہی عطا کر۔

"Sovereign of the Universe! cause me to know what the final decision is on each matter of Law." He replied: "The majority must be followed when the majority declare a thing permitted it is permissible, when the majority

declare it forbidden it is not allowed; so that the Torah may be capable of interpretation with fortynine points *pro* and fortynine point *contra*."
(p. Sanh. 22a) Quoted in Talmud, p. 148.

۲۳ جس طرح اہل یہود نے تورات کے مفہوم اور وحی کے دائرے کو وسعت دے کر اس میں تنعیم، امور ائیم اور سوبور ائیم کی ذہنی کاوشوں کو بھی شامل کرلیا تھا اور اسے من جانب اللہ سمجھ کر تقدس عطا کر دیا تھا، اسی طرح ہمارے یہاں بھی ائمہ اربعہ کی فہم کو دین مبین کی حفاظت کا من جانب اللہ انتظام سمجھا جاتا ہے۔ بقول شاہ ولی اللہ: "**فالمذهب للمجتهدين سرا لهمه اللّٰه تعالىٰ العلماء وجمعهم عليه من حيث يشعرون أو لايشعرون**" یعنی مذہب مجتہدین کی پابندی ایک راز ہے جسے اللہ تعالیٰ نے علماء کے دل میں ڈالا اور ان کو اس پر مجتمع کر دیا خواہ وہ اس کو جانیں یا نہ جانیں۔ (الانصاف مع الترجمہ ص۶۲)

علمائے اسلام کے نزدیک ائمہ اربعہ کو منبع تقلید بنانا نہ صرف یہ کہ اتفاقی بلکہ ایک الہامی امر ہے۔ ان کے علاوہ کسی اور کی تقلید گوارہ نہیں۔ علامہ طحاوی حاشیہ درمختار میں لکھتے ہیں: "**من كان خارجاً عن هذه الاربعة فهو من اهل البدعة والنار.**"

۲۴ Talmud, pp. 154-55

۲۵ ابوحامد محمد الغزالی، کیمیائے سعادت، ترجمہ محمد سعید الرحمٰن علوی، ص ۴۵۸

۲۶ ایضاً، ص ۴۶۰

۲۷ Talmud, p. 179

۲۸ تورات کی تلمودی تعبیر نے یہودی فقہ میں سخت اختلافات پیدا کر دیے۔ یہ وہی عمل تھا جو خلفائے راشدین کے عہد میں روایات کے بیان سے شروع ہوگیا تھا اور جس کی وجہ سے حضرت عمر نے روایت گوئی پر سخت پابندیاں عاید کردی تھیں۔ مشناۃ میں حلل (Hillel) اور شمائی (Shammai) کے اختلاف نے عام قارئین کو بڑے مخمصے میں ڈال دیا۔ عام لوگوں کے لئے یہ فقہی اختلاف سخت پریشانی کا باعث ہوئے۔ اس صورت حال کی اصلاح کے لئے Sadducees تحریک اٹھ کھڑی ہوئی، جس نے وحی کے گرد اس انسانی حصار کو توڑنے کی بھرپور کوشش کی۔ ان لوگوں کا کہنا تھا کہ تحریری تورات کے علاوہ اور کسی زبانی روایت کی کوئی اہمیت نہیں، لیکن فقیہوں کے بھاری بھرکم ناموں کے آگے اسے کامیابی نہ مل سکی۔ Pharisaic کوششوں کو نہ صرف یہ کہ جمہور عقیدے کی حیثیت حاصل ہوگئی بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ بات تسلیم کرلی گئی کہ خدا نے موسیٰ پر مکمل بائبل نازل کیا۔ تلمود اور مدرش نازل کیا یہاں تک کہ ان تمام سوالات کے

جواب بھی جو کوئی سنجیدہ طالب علم رہتی دنیا تک پوچھے گا، اس کے جواب منزل من اللہ تسلیم کئے جائیں گے۔ دلیل یہ دی گئی کہ نہ صرف یہ کہ زبانی تورات منزل من اللہ ہے بلکہ تشریح وتعبیر کے تمام طریقہ کار بھی ذریعہ سماوی سے ہم تک پہنچے ہیں۔ تحریری تورات تو یہ ایک منجمد شئی ہے جسے تبدیل نہیں کیا جاسکتا، لیکن زبانی تورات ان ہی سماوی اصولوں کی روشنی میں مستقل نمو پذیر ہے۔ آرتھوڈکس یہودیت نے اس اصول کو تسلیم کرکے گویا تورات کو اپنی من مانی تعبیرات وخواہشات میں ہمیشہ کے لئے دفن کردیا۔

۲۹؎ Talmud, p. 169

۳۰؎ Deutronomy, 24:1, Revised Standared Version, Quoted in Judaism, C.M. Pilkington, London 2000, p. 35.

۳۱؎ Ibid., p. 35

۳۲؎ کتاب خروج باب ۱۹، ۱-۶

۳۳؎ Teach yourself, p. 21

۳۴؎ متی باب ۲۳، آیات ۲۳-۲۸

۳۵؎ کتاب عموس، باب نہم، آیت ۱-۴

۳۶؎ حدیث کے اصل الفاظ یوں ہیں:

”ما من عبد قال لاالٰہ الا اللہ ثم مات علی ذلک الا دخل الجنة قلت: وإن زنی وان سرق قال: وان زنی وان سرق قلت: وإن زنی وإن سرق؟ قال: وإن زنی و ان سرق. قلت: وإن زنی وإن سرق؟ قال: وان زنی وإن سرق. علی رغم انف أبی ذر.“ (متفق علیه) مشکوٰۃ المصابیح مع انگریزی ترجمہ ج ۱، ص ۱۰۴

۳۷؎ بحوالہ تجدید دین کامل

۳۸؎ دیکھئے بخاری، کتاب الصلوۃ، باب ۵۶

۳۹؎ تفصیلات کے لئے دیکھئے: فتح الباری ج ۱۳، کتاب التوحید، باب ۱۹، حدیث نمبر ۷۴۱۰، ص ۴۰۳۔ مسلم، کتاب الایمان، حدیث نمبر ۳۳۲، ۳۲۶ تا ۳۲۹۔ ترمذی، کتاب التفسیر، سورہ ۱۷، حدیث ۱۹۔ مسند احمد ۱:۴ (بحوالہ دائرۃ المعارف، ص ۷۵۲، ج ۱۱)

۴۰؎ ترمذی، کتاب الصفة القیامة والرقائق والورع، باب ۱۳

۴۱؎ بحوالہ محمد حسین شاہ علی پوری، افضل الرسل، کراچی، ۱۹۹۲ء، ص ۷۵

۴۲ علامہ نورالدین حلبی، **انسان العیون**، محولہ ایضاً، ص ۷۷

۴۳ ایضاً، ص ۷۷

۴۴ ایضاً، ص ۴۱

☆ ☆ ☆